قوسِ قزح

(مجموعۂ کلام)



نظیر علی عدیلؔ

کتاب : قوسِ قزح

صفحات : ۱۷۶

مصنّف : سیّد نظیر علی عدیل

اشاعت : ۱۹۹۳ء

تعداد : پہلی بار (۵۰۰)

کتابت : مشتاق احمد

سرورق : ولی محمّد صدیقی آرٹسٹ (ART SPAN) جمال مارکٹ۔

طباعت لیتھو : دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

طباعت سرِورق :

جلدسازی : حفیظیہ بک بائینڈنگ چھتہ بازار حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

قیمت : پچاس روپے RS 50/-

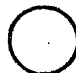
معاونت : جزوی آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد۔

بہ اہتمام : فاروق شکیل۔ بی کام

محبوب علی خاں اخگر قادری

: ملنے کے پتے :

- حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
- اسٹوڈنٹس بک ہاؤس چارکمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
- بک سائیٹس عابدروڈ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
- مصنّف "بیت النظیر" ۲۳-۲-۱۹۰ مغل پورہ حیدرآباد ۲ء





حضرت صفیؔ اورنگ آبادیؒ

فہرست

انتساب، ۶
نقشِ اوّل، ۷
دبستانِ صفی کا روشن چراغ، ۱۱
حمد باری تعالیٰ، ۱۴
نعت شریف، ۱۶
غزلیات، ۱۸
آج رندوں کو ہے غم کس کے بچھڑ جانے کا، ۱۹
دم بخود ہو گا نہ کیسے علم اہلِ علم کا، ۲۱
کئے جاتے ہیں نظارہ تری رعنائی کا، ۲۳
روز کر کے ذکرِ ماضی کرنہ زخموں کو ہرا، ۲۵
دے گیا ویسے تو ہر پیغام پیغمبر کھلا، ۲۷
کسی کی چاہ کا دل نے جب اعتراف کیا، ۲۹
ایک آنسو کے ٹپک جانے سے غم افشا ہوا، ۳۱
یہ فائدہ بھی سزائے گناہ پا کے ہوا، ۳۲
نام گر ثبت نہ سانسوں پہ تمہارا ہوتا، ۳۳
خودی کا راز اگر اس نے آشکار کیا، ۳۴
خلافت پہ انساں فائز نہ ہوتا، ۳۶
سفر کو ختم کرنے پر کبھی مائل نہیں ہوتا، ۳۸
غم نہ پنہاں کبھی ہوتا ہے نہ پنہاں ہو گا، ۳۹
جو حسبِ ضرورت کرنا ہے لے عمرِ گریزاں کر لو گا، ۴۱
نگاہ و دل پہ کوئی چھا گیا تو کیا ہو گا، ۴۳
جس سفینہ کا خود اللہ نگہباں ہو گا، ۴۴
ہو نہ قائم کوئی معیار تو پھر کیا ہو گا، ۴۵
غم سے انساں سنوارا گیا، ۴۶
ابر آلود کیوں آسماں ہو گیا، ۴۷
جب سے کعبے میں اسود نصب ہو گیا، ۴۹
ربطِ نیاز و ناز عجب کام آ گیا، ۵۱
واقعات ماسبق سے جب مدلّل ہو گیا، ۵۳
ڈوبنے کے وقت جب سورج کا کرو فر گیا، ۵۵
گزر کے لوح و قلم سے نگاہِ یار میں تھا، ۵۶
کیا کہیں الفت میں کب سے حال خستہ ہو گیا، ۵۷
دونوں دل آویز دونوں لاجواب، ۵۸

غم غلط کرتی ہے انساں کا شراب ۵۹
نہ اُٹھ گیا ہو کہیں پردۂ خودی اے دوست ۶۱
ہے نئی قسم کی یہ آپ کی اپنائیت ۶۲
صبح کے ٹھنڈے وقت بھی کتنا پیاسا پیاسا ہے سورج ۶۴
وہ بستی دیکھ رہے گھر تھا میرا گھر کی طرح ۶۶
ہیں حسینوں کے جو آنسو ہیں کب آنسو کی طرح ۶۷
جب سے ہے میسر اسے خورشید کی تائید ۶۹
ویسے کوئی نزدیک نہیں راہِ خداوند ۷۱
سمجھا سکے گا ہم کو وہ کیا خاک نیک و بد ۷۳
زندہ کرنے کے لئے مردوں کو ہے یوم النشور ۷۵
وہ کیا کہیں گے صورتِ بیمار دیکھ کر ۷۷
تڑپتا رہا ہے یقیناً سحر تک فضا میں کوئی اشک تھمیں بہا کر ۷۹
کھینچے رہتے ہیں دشت و رہگزار ۸۰
ہوا اس طرح جلوہ آرا وہ پردہ داری سے تنگ ہو کر ۸۱
تابعداروں کے خواب کی تعبیر ۸۲
کچھ بھی ہو نظم میکدہ کوئی ہو انتظام پر ۸۴
عدم کے مسافر تو سب ہیں مگر ۸۵
نہیں تھا جلوہ دکھانے کا کچھ غلط انداز ۸۶
قابلِ احترام ہے اخلاص ۸۸
بدلی کب ابلیس نے مردود ہو کر بھی روش ۸۹
پھیلئے کم ہے وقت موت و زیست کی ہے کشمکش ۹۱
نکالئے نئے ظلم و ستم کی گنجائش ۹۳
خوب ہو تم بھی اے بتو شاباش ۹۴
کی مختلف انداز میں اقوام نے توصیف ۹۵
اُلٹ جائیں گے تیرگی کے طبق ۹۷
کس آنکھ کو دیدارِ خدا کی نہیں تشویق ۹۸
بنا علم سے جتنا ابلیس زیرک ۱۰۰
نہ آئے گا غم میں کبھی وقت نازک ۱۰۲
رنج پر ہے مرنے والے کے رنج و محن کا رنگ ۱۰۴
جب ڈھونڈنے اس کا در گئے ہم ۱۰۵
بخشش کے واسطے کئی آسانیاں بھی ہیں ۱۰۶
اک نیا ہے باب یہ تاریخ کے ابواب میں ۱۰۷
کبھی بہشت کے دن ایسے یاد آتے ہیں ۱۰۸
اس پر بھی کبھی غور کرا اے گردشِ دوراں ۱۰۹
گھبراتے ہیں وہ جب بھی دل کی فضائے غم میں ۱۱۰
غیروں میں نہیں چاہنے والوں میں لئے ہیں ۱۱۱
ہر ایک چہرے پہ سو طرح کا شک ہے میاں ۱۱۳
تم ہی تم ہو جلوہ افگن ۱۱۴
جب بھی جانبِ منزل ہم قدم بڑھاتے ہیں ۱۱۵
اس میں ہے اس کا قیام اہلِ نظر کہتے ہیں ۱۱۶
کہنے والے ترے عارض کو کنول کہتے ہیں ۱۱۷
بات اتنی ہے کہ مجھ کو مانگنا آیا نہیں ۱۱۸
آنکھ میں آنسو نہیں لب پر گلے شکوے نہیں ۱۱۹
جہاں میں کون ہے جو احتیاج مند نہیں ۱۲۱
صبح شبنم میں نہانے سے تر و تازہ نہیں ۱۲۳
تمہارے رویئے پہ حیرت نہیں ہے ۱۲۵
ملے بھی وہ ہم سے تو ایسے ملے ہیں ۱۲۷
موت کو بھی زوال ہے کہ نہیں ۱۲۹

ایسا بھی انقلاب کسی روز کاش ہو، ۱۳۱

دل کے آگے نہیں کوئی رستہ، ۱۳۲

دنیا کو میرا شکوہ سنانے سے فائدہ، ۱۳۴

ان کے جلوہ سے آنکھ پرنم ہے، ۱۳۵

غم سے گھبرا کے اگر جہاں سے ہمارے اترے، ۱۳۷

وقت و حالات سے دیرینہ مرا جھگڑا ہے، ۱۳۹

وہ خوشی رشکِ عید ہوتی ہے، ۱۴۰

اے دوست کہیں اس لئے پردہ تو نہیں ہے، ۱۴۱

دنیا بسا کے مجھ کو کیا فائدہ ہوا ہے، ۱۴۲

آتی ہوئی ہر سانس ہے جینے کی نشانی، ۱۴۴

قدرِ علم و ہنر نہیں نہ سہی، ۱۴۵

زندگانی اس کی جھولی میں نہ ڈالی جائے گی، ۱۴۶

ہو کے جب مغلوبِ غم سے ہر خوشی رہ جائے گی، ۱۴۸

نہ چھوڑنا کبھی تنہا خیالِ یار مجھے، ۱۵۰

اگر سب کے لئے یکساں نگاہِ یار ہو جائے، ۱۵۱

جہاں بھی آپ کا پایا ذرا گماں میں نے، ۱۵۲

عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے، ۱۵۴

کس قدر ہم پہ فضلِ باری ہے، ۱۵۶

بات یہ واضح نہیں یار یک ہے یا رکیسا ہے، ۱۵۸

شان ہی کچھ شبِ فرقت کی نئی ہوتی ہے، ۱۶۰

من و سلویٰ بھی ہو بے وقت تو بے قدر و قیمت ہے، ۱۶۲

انساں حصارِ ذات میں مثلِ غبار ہے، ۱۶۴

جب بھی میں نے کچھ اندازۂ حالات کیا ہے، ۱۶۶

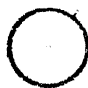
غم کو انساں نے نظروں سے گزار رکھا ہے، ۱۶۸

وقت کی بات ہے جب وقت بدل جاتا ہے، ۱۷۰

نہ لائی وہ بھی اُجالا ہمارے گھر کے لئے، ۱۷۱

اربابِ وفا کی ہر مشکل معیار ہی سے معیاری ہے، ۱۷۲

دیارِ گنگ و جمن، نظم، ۱۷۴



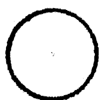
انتساب

اس کے نام...............

جو شعر کہنے پر اکساتا بھی ہے

اور......................

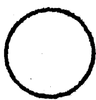
فکرِ شعری بھی ودیعت فرماتا ہے



کبھی عدیل کو شفقت سے یاد کر لینا

پسند آئے اگر اس کی شاعری اے دوست

(عدیل)





نظیر علی عدیلؔ

نقشِ اوّل

(تعارف)

نام :- سیّد نظیر علی

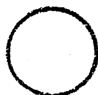
تخلص :- عدیل

پیدائش :- ۲۸ مئی ۱۹۲۸ء

وطن :- حیدرآباد (آندھراپردیش)

تعلیم :- میٹرک (عثمانیہ) منشی فاضل (نظامیہ)

پیشہ : متوظف کوآپریٹیو سب رجسٹرار۔



آدمی کے اندر کا آدمی فنونِ لطیفہ کا ازلی پرستار ہوتا ہے۔ اور جب وہ کوئی ٹھیس پہنچنے پر یا کسی تحریک پر باہر آتا ہے۔ تو حسبِ رجحان کسی کو مغنّی کسی کو مصوّر کسی کو شاعر بنا دیتا ہے چنانچہ میرے اندر کا آدمی جب باہر آیا تو اس کی شعری تلملاہٹ نے مجھے شاعر بنا دیا۔

اپنی درسگاہ (دارالعلوم ہائی اسکول) کی سالانہ تقاریب کے سلسلے میں منعقدہ ایک

مشاعرہ میں شریک ہوا تو دوسرے دن مشاعرے کی طرح پر سات شعر موزوں کر لئے اور اپنے شفیق و محترم والد کو سنائے ۔ وہ شعر سن کر پہلے دنگ رہ گئے پھر محظوظ ہوئے اور بجائے لعن طعن کرنے کے میری حوصلہ افزائی کی ۔ دو چار دن کے بعد وہ مجھے اپنے ایک قریبی دوست حکیم الشعرا شہنشاہِ رباعیات حضرت احمد حسین امجد کے پاس لے گئے اور یہ کہکر ؎

سپردم بہ تو مایۂ خویش را

ان کے سپرد کر دیا ۔

حضرت امجد نے میرے کلام پر اصلاح دینے کے بجائے دو سال تک مستند کتابوں کے ذریعہ باقاعدہ عروض کی تعلیم دی ۔ اور جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل کورس کی تیاری کرائی ۔ کورس کے مکمل ہونے کے بعد میں نے ۱۹۴۲ء میں امتحان دے کر سند حاصل کر لی ۔ اس کے بعد حضرت امجد نے شاعری میں میرے رجحان طبع کو مائل بہ غزل دیکھکر حیدرآباد کے مشہور و مستند غزل گو استاد حضرت صفی اورنگ آبادی سے خود بہ نفسِ نفیس رجوع کر دیا ۔

حضرت صفی نے اپنے انتقال (۱۹۵۴ء) تک میری بڑی دلجوئی کی ۔ اور مربیانہ طریقہ اصلاح سے میری شعری رہنمائی کی ۔ میں چونکہ حضرت صفی کے وسیلے سے حضرت داغ دہلوی کے مکتب سے رجوع ہوا تھا اس لئے ان کا اسلوب بیان ذہن میں رچ بس گیا ۔ البتہ شاعری میں ان کی مکمل اتباع نہیں کی اور اپنے لیے حضرت جگر مراد آبادی کی طرح ایک الگ راہ بنانے کی کوشش کی ۔

شاعری میں سوال صرف اظہار کی ہیئت اور اسلوب بیاں کا ہے ۔ جو شعراء اس طرف توجہ دے کر اپنی شاعری میں اضطراب و تجسس کی نئی راہیں نکالتے ہیں وہ اپنے دور کے ذہنی رویوں سے قریب ہو جاتے ہیں اور اپنا الگ مقام بنا لیتے ہیں ؎

شعر کی فکر نہیں ہے کوئی آسان عدیل
بند شیشے میں بہ مشکل یہ پری ہوتی ہے

لیکن جو شعرا شاعری کے ان اہم نکات کو پیش نظر نہیں رکھتے اور صرف شعر موزوں کر لینے کو شاعری سمجھتے ہیں وہ شاعری کی کوئی خدمت نہیں کرتے اور شعری دنیا میں حرفِ علت کی طرح گرا دیئے جاتے ہیں ۔

میں نے اپنی شاعری میں ان اہم نکات کو پیشِ نظر رکھا ہے اور چونکہ اردو شاعری

میں بے جان ڈھانچوں کی پہلے سے کوئی کمی نہیں ہے۔ اس لئے میں نے ان میں مزید اضافہ سے حتی الوسع گریز کیا ہے بہ الفاظ دیگر میں نے محض قافیہ پیمائی کے بجائے براہِ راست احساس کے وسیلے سے شعر کہے ہیں۔ اور ان میں مضمون سے مضمون نکالنے اور بات سے بات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شعری سفر میں جو راستے مشاعروں، اخبار در سائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہو کر گزرتے ہیں۔ میں نے ان پر کافی سفر کیا ہے۔ حیدرآباد و بیرونِ حیدرآباد کے بے شمار طرحی و غیر طرحی مشاعروں میں کلام سنا چکا ہوں۔ اخبار و رسائل میں مقامی ممتاز روز ناموں، ہفت روزہ جرائد اور ماہناموں کے علاوہ ہندوستان کے تمام معروف و ممتاز رسائل جیسے بیسویں صدی، شمع، روبی آج کل، نیا دور، فلمی ستارے، ہمارا دور، مووی اسٹار، گلفام اور کہکشاں وغیرہ اور روز ناموں میں روز نامہ آفتاب کشمیر، سری نگر ٹائمز، روز نامہ خدمت کشمیر اور روز نامہ ہمدرد کشمیر کے علاوہ روز نامہ ملاپ دہلی، ہفت روزہ ملاپ (لندن) اور فلم اڈوانس بنگلور میں بارہا میرا کلام شائع ہو چکا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے علاوہ ریڈیو کشمیر سری نگر آل انڈیا ریڈیو جالندھر اور آل انڈیا ریڈیو دہلی (لوکل اور اکسٹرنل سروس) سے کلام نشر کر چکا ہوں اس کے علاوہ کشمیر، نئی دہلی جالندھر اور امرتسر ٹی وی اسٹیشنوں سے اپنا کلام ٹیلی کاسٹ کر چکا ہوں اور حیدرآباد دوردرشن سے کرتا رہتا ہوں۔

میرے مذہبی کلام (حمد، نعت، منقبت) کو بمبئی کی ہز ماسٹرس وائس گراموفون کمپنی نے پدم شری عزیز احمد خاں وارثی کی آواز میں ریکارڈ کیا ہے۔ اور اس وقت ملک و بیرونِ ملک میں میرے تین گراموفون ریکارڈ زیرِ گشت ہیں۔ جنہیں آئے دن سری نگر کشمیر، دہلی، بھوپال لکھنو اور حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشنوں سے سنوایا جاتا ہے۔

میں اپنے مذہبی کلام (حمد، نعت، سلام، مناقب) کو علحدہ کتابی شکل میں پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تاہم ایک حمد اور ایک نعت تبرکاً شریکِ مجموعہ ہے۔

میرے اس مجموعہ کلام کی اشاعت میں میں اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے تعاون کے علاوہ جن بہی خواہوں نے اس سلسلے میں بھرپور تعاون کیا ہے ان میں سرِ فہرست میرے عزیز ترین شاگرد مسرور عابدی ہیں جنھیں میں اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں دوسرے اشہر ندیمی ہیں۔

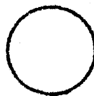
جو میرے ہی شاگرد ہیں اور مجھ سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ دونوں افق شاعری پر آفتاب کی طرح چمکیں (آمین)

آخر میں میرے محبِ خاص جناب محبوب علی خاں اخگرؔ نے مجموعۂ کلام کو منظرِ عام پر لانے کے لئے جس قدر محنت کی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے

میں ایکبار پھر ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

خونِ دل قوسِ قزح میں پیش ہے
گر قبول افتد زہے عز و شرف

نظیرؔ علی عدیلؔ
بیت النظیر ۱۹۔۹۔۲۳
مغل پورہ حیدرآباد (اے۔پی)
۵۰۰۰۰۲



دبستانِ صفیؔ کا روشن چراغ

حیدرآباد ہمیشہ مرکزِ علم وفن رہا ہے اردو زبان نے یہاں ترقی کی۔ ادب نے نشو و نما پائی اور یہاں کی محبت بھری فضاؤں نے اسے پروان چڑھایا۔ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک کیسے کیسے ادیب اور شاعر یہاں پیدا ہوئے۔ ان میں سے کئی ایک نے شہرت کی چوٹی کو چھو لیا۔ کتنوں نے مقبولیت کی سند حاصل کی۔ لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ بہت سے صاحبانِ علم و فن ایسے بھی تھے جن کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا۔ وہ اپنے کمال اور فنی عظمتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی ہی میں رہ گئے۔ زمانے نے اس وقت کچھ توجہ کی نہ آج کے محققین ان عظیم گم شدہ شخصیتوں کی تلاش میں زحمت اٹھانا پسند کرتے ہیں۔

شہرِ حیدرآباد کی محبت اور عنایات ہمیشہ ہی اپنوں سے زیادہ غیروں پر رہیں۔ اپنے ہیروں کو پہچاننے، پرکھنے اور اپنی کلاہ میں سجانے کی حیدرآبادیوں نے بہت کم کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ نے سب سے پہلے ہماری اس کم نگاہی کو شدت سے محسوس کیا۔ انہوں نے تمام عمر دکن کے شہ پاروں کو منظرِ عام پر لانے اور ادب کے شہسواروں کی قدر شناسی میں صرف کر دی۔ آج بھی ضرورت ہے اس بات کی کہ ہم اپنی قریب کی نظر کا علاج کریں۔ اپنوں کو دیکھیں، ان کی محنتوں، محبتوں اور ان کی صلاحیتوں کو پہچانیں۔ ان کے فن اور کمال کی قدر دانی کریں۔ اپنے فنکاروں کو ان کا صحیح

مقام دلانے کی کوشش کریں۔ آج بھی ہمارے شہر میں حضرت نظیر علی عدیلؔ جیسی عظیم شخصیتیں ڈاکٹر زور کا انتظار کر رہی ہیں۔

نظیر علی عدیلؔ حیدر آباد کے ان بزرگ شاعروں میں سے ایک ہیں جن کی ساری زندگی فکر و فن کی آبیاری میں گزری۔ وہ ایک زود گو، پر گو بلکہ بلا گو شاعر ہیں۔ وہ دبستانِ صفیؔ کے روشن چراغ ہیں۔ ان کی اپنی ایک انجمن ہے اور اس انجمن کے کئی پروانے۔ انہوں نے اب تک (۱۳۵۰) غزلیں کہی ہیں۔ ان کی ہر غزل پچاس ساٹھ بلکہ کبھی کبھی سَو اشعار کی ہوتی ہے۔ ہر شعر ان کی منتخب کے بیاضِ سخن کی زینت نہ بن سکا۔ کیوں کہ وہ اپنی غزلوں کا انتخاب بھی بڑی سختی سے کرتے ہیں۔ اسی لئے قوسِ قزح کی تین سو غزلوں کے رنگ و نور کی چمک دمک میں کہیں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ان کی غزلیات میں روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ جدیدیت کا صحت مندانہ رچاؤ بھی ہے وہ اپنے عصر کے ادبی تقاضوں کو بھی سمجھتے ہیں۔ اور روایت کی حسین پابندیوں سے رشتہ بھی نہیں توڑتے۔ ان کے کلام میں ماضی اور حال کا خوبصورت امتزاج اور توازن ملتا ہے جس نے ان کی غزلوں کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

دبستانِ صفیؔ کا نمایاں وصف زباں کی سادگی، سلاست، محاورہ بندی جذبے کی شدت اور اظہار کا سلیقہ ہے۔ اور اس میں علم و عرفان کی نیازمندی اور یک گونہ قلندرانہ بے نیازی بھی شامل ہے۔ حضرت نظیر علی عدیلؔ کے ہاں ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ نشاط و غم کا تناسب ہے۔ خواہشوں، امیدوں، آرزوؤں کا ایک سمندر ہے اور یادوں کا ایک دشت۔

دکن کے شاعروں میں ولیؔ، سراجؔ، داؤدؔ اور حضرت شمس الدین فیضؔ کے پاس اردو اور فارسی کا جو رچاؤ ہے۔ وہی نظیر علی عدیلؔ کے کلام کی تازہ فضا میں نکھر کر سامنے آتا ہے۔ نظیر علی عدیلؔ نے فارسی لفظیات، محاوروں اور ضرب الامثال کے برجستہ استعمال سے اپنے لہجے کو باوقار بنایا ہے کہیں اس سے شوخی اور طنز کا کام بھی لیا ہے چند شعر نمونتاً یہاں پیش ہیں۔

بدلیں عمامہ یا پھر خرقے کا لیں سہارا
من خوب می شناسم پیرانِ پارسارا

کیوں نہ باور ہو کہ ہیں وہ بے نقاب
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

کم سخن بھی کرو ہے فقرے چست
آفریں یاد ایں گلے دیگر شگفت

تم کو دنیا کی فکر کیوں ہے عدیلؔ
کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد!

سمجھا سکے گا ہم کو وہ کیا خاک نیک و بد
او خویشتن گم است کرا رہبری کند

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
کیا یہ دنیا ابھی نمو میں ہے

نظیر علی عدیلؔ نے مشکل سے مشکل زمینوں میں خوب شعر نکالے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں ان کا رخشِ قلم اور تیز گام ہو جاتا ہے مجموعی طور پر جناب عدیلؔ کا کلام ان کی شاعرانہ عظمت کی غمازی کرتا ہے۔ افسوس اس کا ہے کہ ان کے شایانِ شان قدر شناسی آج بھی نہیں ہو سکی جس کے وہ بلا شبہ مستحق ہیں۔

۱۰/ اکتوبر ۱۹۹۲ء

ڈاکٹر اشرف رفیع
پروفیسر شعبہ اردو
عثمانیہ یونیورسٹی

حمد باری تعالیٰ

ندائے ارض و سما لا الٰہ الاّ اللہ
فقط خدا ہی خدا لا الٰہ الاّ اللہ

ہے کون اس سے بڑا لا الٰہ الاّ اللہ
بڑے بڑوں نے کہا لا الٰہ الاّ اللہ

پھڑک کے روح جب آدم کے جسم میں آئی
دھڑک کے دل نے کہا لا الٰہ الاّ اللہ

بدلتی کیوں نہ گلستاں میں آتشِ نمرود
لبِ خلیل پہ تھا لا الٰہ الاّ اللہ

زباں جو گنگ ہوئی طور کے اُجالے میں
نظر نے کلمہ پڑھا لا الٰہ الاّ اللہ

نہیں ہے اس کے سوا کوئی مالک و معبود
اسی کو ہے سجدہ روا لا الٰہ الا اللہ

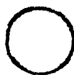
ذرا سا فرق ہے دیر و حرم کے سازوں کا
مگر ہے ایک صدا لا الٰہ الا اللہ

صدی صدی سے گزر کر صدی صدی کیلئے
پکارتا ہے صدا لا الٰہ الا اللہ

محققین نے تحقیق کر کے ہر رخ سے
بیک زبان کہا لا الٰہ الا اللہ

کلی زبان نہ پا کر بھی کب رہی خاموش
چٹک چٹک کے کہا لا الٰہ الا اللہ

چھڑا ہوا ہے رگِ جاں کا تار تار عدیل
نکل رہی ہے صدا لا الٰہ الا اللہ



نعتِ سرورِ کونین صلعم

کب آئی انبیأ میں یہ شانِ مصطفائی
اک ہاتھ میں رسالت اک ہاتھ میں خدائی

خلوت میں جب خدا تھا مصروفِ رونمائی
سرکار صلعم کو وہاں بھی امت کی یاد آئی

خود ہی ظہورِ اول خود ہی ظہورِ آخر
وہ شانِ ابتدائی یہ شانِ انتہائی

دنیا ہے جس سے روشن وہ نور آپ کا ہے
شمس و قمر تو ہیں خود اس نور کے فدائی

اللہ رے اُن کے گیسو اللہ رے اُن کے عارض
تعریف کی نہ رب نے جب تک قسم نہ کھائی

دیکھا نبی صلعم نے رب کو رب نے نبی صلعم کو دیکھا
معراج میں بھی گویا دو طرفہ رونمائی

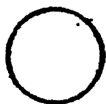
دیکھا ہے جب سے اُن کو حیرت زدہ ہے نرگس
اک پل نہ آنکھ جھپکی اِک پل نہ نیند آئی

کرنا پڑا ہے اس کو معراج کا بہانہ
پہنچی عروج پر جب محبوب کی جدائی

اک نسبتِ قدم نے قسمت بدل کے رکھ دی
نعلین جیسی شے نے کی عرش تک رسائی

اللہ کے بعد اُن ؐ سے کوئی بڑا نہیں ہے
پایا ہے بندگی میں اندازِ کبریائی

کیوں فکرِ مغفرت ہے تم کو عدیل آخر
جب اُن کے ہاتھ میں ہے محشر کی کاروائی



غزلیات



یادِ محبوب اگر شکل میں ڈھل جاتی ہے
دیکھنے والے اُسے تاج محل کہتے ہیں

(عدیلؔ)





آج رندوں کو ہے غم کس کے بچھڑ جانے کا
منہ پھرا لیتے ہیں منہ دیکھ کے پیمانے کا

دعویٰ خوں ہے غلط شمع پہ پروانے کا
خود اسے شوق ہے جلتے ہوئے مر جانے کا

داخلہ ٹھیک نہیں بزم میں دیوانے کا
کہیں اس پر کوئی سایہ نہ ہو ویرانے کا

مصر نے پائی ہے اک اندھے کنویں سے شہرت
ہائے اک شہر پہ احسان ہے ویرانے کا

شہر میں ہر کوئی بیگانہ نظر آتا ہے
گاؤں میں وہم و گماں تک نہیں بیگانے کا

کچھ تو موسیٰ کو بھی حسرت تھی نظر بازی کی
اور کچھ شوق تھا اس کو بھی نظر آنے کا

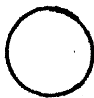
زلف و رخسار کہاں اور شب و روز کہاں
کچھ محل ہی نہ تھا قرآں میں قسم کھانے کا

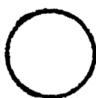
گل نے کیوں پائی سزا چاک گریبانی کی
کیا اڑایا تھا مذاق آپ کے دیوانے کا

شیخ آئے نہ کہیں بھیس بدل کر رندو
راستہ پوچھ رہا تھا کوئی میخانے کا

کہیئے دشمن سے ذرا وار سلیقے سے کرے
کہیں ٹوٹے نہ بھرم آپ کے یارانے کا

پہلے وہ مشق کریں چہرہ بدلنے کی عدیم
ورنہ اندیشہ ہے پہچان لئے جانے کا





دم بخود ہوگا نہ کیسے عالم اہلِ علم کا
جسم جیسا علم ہو، سایہ نہ ہو گر جسم کا

ہے طلبگار یہ معلّم علم ہر اک قسم کا
ہاں شمار ان میں نہیں ہے اک لدنّی علم کا

آج تک دیکھا نہ اس میں شائبہ تک علم کا
یہ شخص ہے انسان تو انسان ہے کس قسم کا

جو کبھی گھٹتا نہیں، کوئی چرا سکتا نہیں
ہے وہ دنیا کے خزانوں میں خزانہ علم کا

دوسروں کی، عیب جوئی کرتے ہیں اکثر وہ لوگ
عیب اپنی ذات میں رکھتے ہیں جو ہر قسم کا

فہم کے قابل نہیں ہے حبسِ دم، پھر تا حیات
بند پتھر میں گزارہ کرنے والے کرم کا

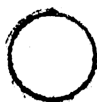
اس میں گھس بھروا کے لٹکاتے تھے وسطِ شہر میں
یہ بھی اک مصرف تھا پہلے آدمی کے چرم کا

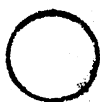
نام اللہ کا عبادت میں بھی شامل ہے مگر
ہے مصیبت میں اثر کچھ اور ہی اس اِسم کا

چوم لیتے ہیں انگوٹھے لوگ سنتے ہی اسے
احترام اس درجہ ہے اک چار حرفی اسم کا

ویسے خود ان کی نگاہوں میں بھی کچھ اچھا نہیں
پیٹ کی خاطر سے جو کرتے ہیں دھندہ جسم کا

زندگی رہتی ہے اترائی ہوئی سی اے عدیل
ساتھ جب تک روح سے رہتا ہے قائم جسم کا





کئے جاتا ہے نظّارہ تری رعنائی کا
کیا کلیجا ہے حقیقت میں تماشائی کا

رکھ بھرم حشر میں یارب دلِ شیدائی کا
حشر تو اک بڑا بازار ہے رسوائی کا

حسن نے کر دیا قابیل کو اندھا ورنہ
خون کرتا نہ کبھی اپنے سگے بھائی کا

اصل میں ہاتھ وہ دشمن کی طرف اٹھے تھے
دیکھنے والوں کو دھوکہ ہوا انگڑائی کا

آگے دیوانہ گیا رہ گئے دانا پیچھے !
قصۂ دار میں نکتہ ہے یہ دانائی کا

زیست کی جنگ میں ہم ہار تو دیں گے لیکن
کوئی امکان نہیں ہے کہیں پسپائی کا

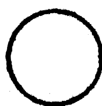
کیا کریں گے وہ مسیحائی مریضِ غم کی
تجربہ ہی نہیں جب ان کو مسیحائی کا

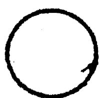
شہر میں کس لئے آ کر نہیں رہتا مجنوں
داخلہ بند نہیں ہے کسی صحرائی کا

ہر جگہ اور ہر اک ذرّے میں جب ہیں موجود
نام کیوں ان کو گوارا نہیں ہرجائی کا

وہ نظر آئے تو دیکھیں گے سنبھل کر اس کو
ہم ہیں موسیٰ نہ کوئی زعم ہے بینائی کا

نہ میسّر ہوا اب تک کسی لشکر کو عدیل
وہ جو انداز ہے مژگاں کی صف آرائی کا





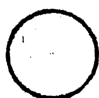
روز کر کے ذکرِ ماضی کر نہ زخموں کو ہرا
"کہ ہے گا ہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

دل لگاؤں اس سے میں کیوں کیا ہے دنیا میں دھرا
لاکھ بھی کچھ ہو مگر دنیا ہے اک فانی سرا

سیر کرنے آئے تھے لیکن یہاں دل لگ گیا
آدمؑ و حواؑ کا ہے یہ مختصر سا ماجرا

یوں تو کہنے کو ضمیرِ انساں کا بے آواز ہے
کاروانِ زندگی میں ہے یہ مانندِ درا

بھر لیا آخر زمیں نے ہم کو اپنی گود میں
زخم جو دل پر لگا تھا وہ نہ مرنے تک بھرا



دے گیا دیسے تو ہر پیغام پیغمبر کھلا
لیکن اس کو جتنا کھولا اور بھی کھل کر کھلا

جو ازل کا راز سربستہ تھا دنیا پر کھلا
ایک شب چپکے سے جب یہ گنبدِ بے در کھلا

غم نہیں اس کا مرے اعمال کا دفتر کھلا
غم ہے اس کا سامنے سب کے سرِ محشر کھلا

ابر چھایا، چھا کے برسا اور پھر تھم کر کھلا
ساتھ ہی اک شور اٹھا میکدے کا در کھلا

چل بسا کیا آپ کا بیمار، یہ کیا حال ہے
آنکھ پرنم، ہونٹ لرزاں، پاؤں ننگے سر کھلا

ابتدأ مسئلے مذہب کے چھانٹے شیخ نے
اور پھر میخانے میں دو چار دن رہ کر کھلا

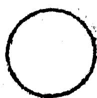
ایسا کچھ الجھا کے ہم کو ساتھ لے آئی اجل
چھوڑ کر دنیا میں آئے اپنا گھر کا گھر کھلا

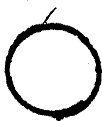
پہلے تو خط میرا لکھوایا ہے اس نے غیر سے
اس پہ طرفہ یہ کہ لایا اس کو نامہ بر کھلا!

زندگی نے ساتھ چھوڑا موت لینے آ گئی
ایک در کے بند ہوتے ہی نیا اک در کھلا

دے جو چھپّر پھاڑ کر تو پھر بنا بھی دے اسے
ورنہ پھر کیا فائدہ، رہ جائے گا چھپّر کھلا

قبر بھی اک گھر ہے لیکن ہے عجائب گھر عدیلؔ
بند ہے اندر سے جتنا اتنا ہے باہر کھلا





کسی کی چاہ کا دل نے جب اعتراف کیا
خرد نے کیوں نہیں معلوم اختلاف کیا

خدا نے اس طرح کلمے میں اعتراف کیا
کہ اپنے نام سے اس نام کو مضاف کیا

نہ پائی شہر میں جب اپنے دل کی یکسوئی
تو جا کے دشت میں مجنوں نے اعتکاف کیا

بس ایک حکم سے تخلیق دو جہاں کی ہوئی
اس ایک حکم میں اجماعِ نون و کاف کیا

جلا کے چھوڑا پتنگے کو شمع نے آخر
اگرچہ اس نے بہت دور سے طواف کیا

گنہ سمجھ کے گنہ کب کیا ہے آدمؑ نے
عروضِ زیست میں تبدیل اک زحاف کیا

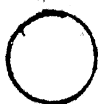
کہاں سے کوہ میں فرہاد جوئے شیر آتی
جو کام تو نے کیا عقل کے خلاف کیا

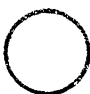
دم ان کا بھرتا ہے رہ کر ہمارے پہلو میں
بڑا قصور ہے دل کا مگر معاف کیا

پچھاڑنے کے لئے آئے تھے جو لوگ مجھے
پچھڑ گئے تو مرے فن کا اعتراف کیا

سگِ نجس میں صفائی یہ کس بلا کی ہے
جہاں بھی بیٹھا ہے پہلے جگہ کو صاف کیا

خود اس کا گھر بھی بہا سب گھروں کے ساتھ عدیلؔ
ندی کے بند میں جس شخص نے شگاف کیا





ایک آنسو کے ٹپک جانے سے غم افشا ہوا
تھا سمندر کا سمندر بوند میں ٹھہرا ہوا

یاد ہے کل ہم ملے تھے پھر نہ جانے کیا ہوا
وہ بھی کچھ کھوئے ہوئے تھے میں بھی کچھ کھویا ہوا

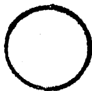
اپنی اپنی راہ سے نکلے تھے یاران خودی!
سب سے پہلے آ گیا میں دار سے ہوتا ہوا

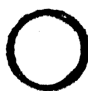
اور بھڑکی آتش فرقت سمندر کے قریب
جل رہا ہے کوئی ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہوا

آدمی تو آدمی گھر بھی نظر آتے نہیں
شہر میں ایسا ہے نفرت کا دھواں پھیلا ہوا

دور تھا وہم و گماں سے یا وہ میرے دل میں ہے
کتنا لمبا راستہ ہے کس قدر سمٹا ہوا

آ گئے جب اے عدیل احباب کھل کر سامنے
تب کہیں ہم کو ہوا کے رخ کا اندازہ ہوا





یہ فائدہ بھی سزائے گناہ پا کے ہوا
میں اس جہان کا وارث زمیں پہ آ کے ہوا

ملال اس لئے ان کو مجھے مٹا کے ہوا
کہ سربلند میں کچھ اور سر کٹا کے ہوا

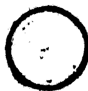
رہِ وفا میں سفر زحمتیں اٹھا کے ہوا
ہر ایک گام پہ پتھر ہٹا ہٹا کے ہوا

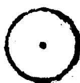
سلگ اٹھے ہیں جب اشرار کچھ تعصب سے
دل ان کا ٹھنڈا کئی بستیاں جلا کے ہوا

رہا نہ درد ہمارا ہی قابلِ درماں
جب ان کو درد کا احساس دل دکھا کے ہوا

اب آٹھ آٹھ پہر ان کو بھی قرار نہیں
یہ تجربہ تو مرا صبر آزما کے ہوا

ہے زیست سے بھی زیادہ سکون بخش عدیلؔ
یہ انکشاف قضا کو گلے لگا کے ہوا





نام گر ثبت نہ سانسوں پہ تمہارا ہوتا
ہم کو اک سانس بھی لینا نہ گوارا ہوتا

سب کا ہو کر بھی اگر کوئی ہمارا ہوتا
زیست تو زیست ہے مرنا بھی گوارا ہوتا

جب نہیں چھوڑی سجانے میں کسر دنیا کو
یوں ہی قسمت کو غریبوں کی سنوارا ہوتا

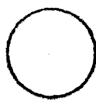
مانگتا اس سے جو بندوں کو دیا کرتا ہے
آگے بندوں کے نہ دامن کو پسارا ہوتا

آدمی تھا وہ کرائے کا پٹا جو مجھ سے
جنگجو واقعی ہوتا تو نہ ہارا ہوتا !

بے کنارا نہیں دنیا میں سمندر کوئی
بحرِ غم کا بھی کہیں کوئی کنارا ہوتا

کیوں مقدر میں ہیں منحوس ستارے ہی عدیلؔ
ان میں ایک آدھ تو فرخندہ ستارا ہوتا





خودی کا راز اگر اس نے آشکار کیا
اسے زبان نہ دی جس کو راز دار کیا

اس اہتمام سے وعدے پہ اعتبار کیا
لگا کے عمر کا سرمایہ انتظار کیا

سکون پانے کو ہم نے خیالِ یار کیا
خیالِ یار نے کچھ اور بے قرار کیا

کیا جنوں نے بھی جب تک لحاظِ یار کیا
پھر اس کے بعد گریباں کو تار تار کیا

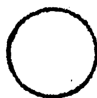
کبھی وفا نے اجازت نہ دی تڑپنے کی
وفورِ غم نے تقاضہ تو بار بار کیا

ہے اعتبار کوئی جرم تو سزا دیجے
گناہ گار نے رحمت پہ اعتبار کیا

اگر ہو حشر میں پرسش تو ہم بھی پوچھیں گے
گناہ گار کو کس نے گناہ گار کیا

کلی کی عمر نہ کیوں مسکراتے گزرے گی
کھلی جب آنکھ تو نظارۂ بہار کیا

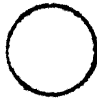
عدیلؔ دوست سے دشمن ہی پھر غنیمت ہے
کیا جب اس نے مقابل میں آکے وار کیا



قطعہ

آثار تو ضرور ہیں کچھ اس میں شک نہیں
آئی ہوئی ہے باغِ جہاں میں بہارِ عید
دیدارِ دوست کے لئے دل بے قرار ہے
مجھکو ہے عید میں بھی عدیلؔ انتظارِ عید





خلافت پہ انساں فائز نہ ہوتا
اگر منکسر اور عاجز نہ ہوتا

اگر دل سے قابیل عاجز نہ ہوتا
سگے بھائی سے ہی مبارز نہ ہوتا

اگر جذب ہوتا نہ خونِ شہیداں
زمیں میں کبھی کوئی قرمز نہ ہوتا

ہے کچھ دشمنوں کی لگائی بجھائی!
کوئی ہم سے بے وجہِ ستیز نہ ہوتا

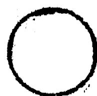
قیامت ہی سب روزِ آخر کو کہتے
اگر نام اِس کا تجوز نہ ہوتا

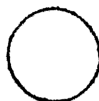
اگر مل گئی ہوتی مجنوں کو لیلیٰ
بیاباں کی مسند پہ فائز نہ ہوتا

اجل اس سے پوچھے بغیر آگئی ہے
وگرنہ وہ راضی تو ہرگز نہ ہوتا

جو تاثیرِ گندم تھی وہ خلد تک تھی
یہاں کس لئے پھر وہ جائز نہ ہوتا

عدیلؔ ایک سجدہ میں رکھا ہی کیا تھا
یہ انجامِ ابلیس ہرگز نہ ہوتا!





سفر کو ختم کرنے پر کبھی مائل نہیں ہوتا
مسافر زندگی کا طالبِ منزل نہیں ہوتا

وہ ذمہ دار ہیں خود جو نظر سے قتل ہوتے ہیں
پشیماں قتل پر ایسے کوئی قاتل نہیں ہوتا

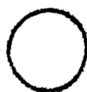
گزر جاتا ہے آکر اک مقام ایسا محبت میں
جہاں مشکل سے بھی اندازۂ مشکل نہیں ہوتا

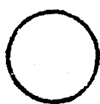
نہ ہو بیزار سائل سے کہ ہے وہ قدر کے قابل
دھری رہ جاتی تیری دین اگر سائل نہیں ہوتا

ترا دیوانہ رہتا ہے ہمیشہ بھیڑ میں لیکن
بجائے خود کبھی وہ بھیڑ میں شامل نہیں ہوتا

کسی حیلے سے گر فرعون رک جاتا کنارے پر
تو غرقِ نیل اس کا دعوئ باطل نہیں ہوتا

نہیں ملتی مثالِ مہر و ماہ آوارہ گردی میں
عدیلؔ ان میں کوئی آسودۂ منزل نہیں ہوتا





غم نہ پنہاں کبھی ہوتا ہے نہ پنہاں ہوگا
منہ نہ کھولو گے تو چہرے سے نمایاں ہوگا

داخلہ خلد میں اے عاصیو آساں ہوگا
تھک کے غافل ذرا جب خلد کا درباں ہوگا

بس ذرا بنتِ گداگر کو جواں ہونے دو
اس کی گٹھڑی ہی میں اک لعلِ بدخشاں ہوگا

بھیج دوں کبر کے اپاہج میں اگر دشمن کو
بھیجنے والا اسے کتنا پشیماں ہوگا

یہ الگ فائدہ ایوان کے معمار کو ہے
سوئے گا جھونپڑے میں خواب میں ایواں ہوگا

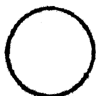
معترض کیوں ہو مرے دل پہ بتاؤ تو سہی
دل ہے ایسا بھی کوئی جس میں نہ ارماں ہوگا

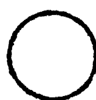
شمع کے اشک بھی رو دیں گے نہ پروانے کو
اس کو ہونا ہے بہرحال وہ قرباں ہوگا

اور تو اور زلیخا کو بھی اندازہ نہ تھا
افقِ مصر پہ روشن مہِ کنعاں ہوگا

جا کے جڑ جائے گا وہ موت کے پیراہن میں
منقطع جاں سے اگر تارِ رگِ جاں ہوگا

پاس رکھنا ہی پڑے گا انہیں وعدے کا عدیلؔ
وعدے کے ساتھ اگر بیچ میں قرآں ہوگا





جو حسبِ ضرورت کرنا ہے اے عمرِ گریزاں کر لوں گا
جینے سے جب اُکتا جاؤں گا مرنے کے بھی ساماں کر لوں گا

ہو جائے اگر توفیقِ جنوں تسکین کے ساماں کر لوں گا
آئے نہ آئے موسمِ گل میں چاک گریباں کر لوں گا

جب زیست کی صورت ہو نہ کوئی میں موت کے ساماں کر لوں گا
اک شمع اگر بجھ جائے گی اک شمع فروزاں کر لوں گا

اس فکر میں شاید غم تیرا رہتا ہے شریکِ دل ہو کر
قربت کے صلے میں جیسے اسے میں شاملِ ارماں کر لوں گا

یہ سچ ہے اگر دیوانوں سے پرسش ہی نہ ہونے پائے گی
محشر میں پہنچنے سے پہلے میں چاک گریباں کر لوں گا

ہر شے میں نظر آنے والا یوں میری نظر سے اوجھل ہے
جیسے میں چھپا لوں گا دل میں یا آنکھ میں پنہاں کر لوں گا

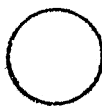
اس رخ سے نقاب اٹھے تو سہی باقی نہ رہے گی لے تو ری
تجھکو بھی شریک نظارہ اے نرگس حیراں کر لوں گا

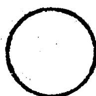
بڑھتا ہوں اکیلا سوئے عدم خطرہ ہو اگر رستے میں کہیں
اس وقت جو یاد آجائے گا اس کو ہی نگہباں کر لوں گا

مصروف ہوں اب تو جینے میں ہاں جب بھی مجھے فرصت ہو گی
میں تیری طرح جینے سے گریز اے عمر گریزاں کر لوں گا

جو کچھ تجھے کرنا ہے کر لے ہر داؤ لگا جو ممکن ہے
جو کچھ مجھے کرنا ہے میں بھی اے گردشِ دوراں کر لوں گا

اب ان پہ اثر کچھ ہو کہ نہ ہو یہ بات مقدر کی ہے عدیل
میں غم کو نمایاں کرنے کی کوشش بہرامکاں کر لوں گا





نگاہ و دل پہ کوئی چھا گیا تو کیا ہوگا
میں اپنے آپ سے اکتا گیا تو کیا ہوگا

بڑھا کے اُنس وہ ٹھکرا گیا تو کیا ہوگا
سکوں کے پردے میں تڑپا گیا تو کیا ہوگا

نباہنا مجھے آتا تو ہے گناہوں کا
خدا کے سامنے گھبرا گیا تو کیا ہوگا

قضا کے بعد تو زحمت نہ ہوگی جینے کی
قضا سے پہلے دل اکتا گیا تو کیا ہوگا

جھجک رہی ہے کلی کھل کے مسکرانے سے
پلٹ کے دورِ خزاں آ گیا تو کیا ہوگا

دہک رہا ہے جہنم مری توقع پر!
خدا کو مجھ پہ ترس آ گیا تو کیا ہوگا

میں خود سے دور ہوں اس کو قریب پا کے عدیل
اگر وہ اور قریب آ گیا تو کیا ہوگا





جس سفینے کا خود اللہ نگہباں ہوگا
پار لگ جائے گا وہ فاتحِ طوفاں ہوگا

پھول کو دیکھ کے جو چاک گریباں ہوگا
اس کی نظروں میں گلستاں بھی بیاباں ہوگا

ان کے آنے سے قضا ٹل نہیں سکتی لیکن
وقتِ آخر ذرا بیمار کا آساں ہوگا

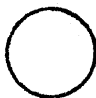
کیا خبر ہے کہ بنی ہے یہ زمیں جس کے لئے
پاؤں رکھتے ہی زمیں پر تہی داماں ہوگا

ذاتِ حق تک وہ بتدریج پہنچ سکتا ہے
پہلے خود ذات کا اپنی جسے عرفاں ہوگا

قرض وہ کیسے چکائے گا وہاں دنیا کا
حشر میں ہر کوئی جب لئے سر وساماں ہوگا

داخلہ آہ کا ہو جائے گا آسان عدیلؔ
گر مقرر نہ درِ عرش پہ درباں ہوگا





ہو نہ قائم کوئی معیار تو پھر کیا ہوگا
عام ہو جائے اگر پیار تو پھر کیا ہوگا

قتل کرنا ہے تو نظریں نہ ملاؤ ورنہ
گر گئی ہاتھ سے تلوار تو پھر کیا ہوگا

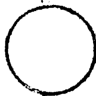
کان رکھتی ہے تو رکھنے دو کوئی فکر نہیں
بولنے بھی لگے دیوار تو پھر کیا ہوگا

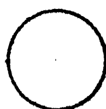
رہ گیا زعمِ خدائی میں نہ سمجھا نمرود
آگ ہو جائے گی گلزار تو پھر کیا ہوگا

اک کنواری کو قبیلے کی اڑا نے والا
خود قبیلے کا ہو سردار تو پھر کیا ہوگا

واسطہ ہی نہ پڑا ہو جسے ملاحی سے
اس کے ہاتھوں میں ہو پتوار تو پھر کیا ہوگا

ہیں کئی داؤ مقابل سے نمٹنے کے عندلیبؔ
دوست پیچھے سے کریں وار تو پھر کیا ہوگا





غم سے انساں سنوارا گیا
کس سلیقے سے مارا گیا

چیخ اُٹھا غم مری موت پر
ہائے میرا سہارا گیا

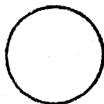
مجھ پہ دشمن نہ جب چھا سکے
دوستوں کو ابھارا گیا

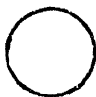
لوگ چونکے مرے نام پر
یوں تو سب کو پکارا گیا

بچ گیا جب میں ہر وار سے
مجھ کو دھوکے سے مارا گیا

اتنا کس کو ملا آج تک
جتنا دامن پسارا گیا

اُن پہ صدقے اُتر جا عدیلؔ
جن پہ قرآں اتارا گیا





ابر آلود کیوں آسماں ہو گیا
کیا مکمل کوئی آشیاں ہو گیا

اس کی مرضی کے دو رخ ہیں موت و حیات
اک نہاں ہو گیا اک عیاں ہو گیا

شاید اس میں ہے اس کی کوئی مصلحت
کر کے ظاہر ہمیں خود نہاں ہو گیا

جذب ہو کر ہماری جبیں رہ گئی!
اب ترا آستاں آستاں ہو گیا

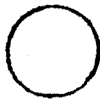
پاؤں کے آبلے پھوٹ کر رو دیئے
دور نظروں سے جب کارواں ہو گیا

گلستاں میں تبسم کھانے اک گل نہیں
زرد اس غم سے رنگِ خزاں ہو گیا

آرہی تھی ہنسی مجھکو حالات پر
ان کو دیوانگی کا گماں ہو گیا

دو جہاں لے کے اپنا سا منہ رہ گئے
اس کو ہونا تھا دل میں نہاں ہو گیا

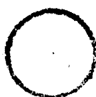
صبح دم ہے فضا میں نمی سی عدیلؔ
کس کے غم میں شریک آسماں ہو گیا



قطعہ

تغیّرات تو آتے رہیں گے دنیا میں
سب اک جگہ نہ رہے ہیں نہ رہنے پائیں گے
بچھڑنے والوں نے کچھ ایسے نقش چھوڑے ہیں
کہ یادداشت ہے جب تک وہ یاد آئیں گے





جب سے کعبے میں اسود نصب ہو گیا
قابلِ احترام و ادب ہو گیا

آدمی مائلِ عشق جب ہو گیا
سنگِ بنیادِ غم کا نصب ہو گیا

ان کے آتے ہی عالم عجب ہو گیا
یک بہ یک تازہ دم جاں بلب ہو گیا

مہرباں جس کسی پر بھی رب ہو گیا
اس کا ہر کام حسبِ طلب ہو گیا

آئینہ دیکھتا ہے تمہیں گھور کر
منہ لگاتے ہی کیا بے ادب ہو گیا

قیس لیلیٰ کا مجنوں ہی مشہور ہے
نام سے بڑھ کے اس کا لقب ہو گیا

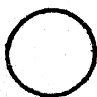
دل کے آنگن میں غم آ گیا کس طرح
دل کی دیوار میں کیا نقب ہو گیا

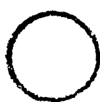
چل بسا جاں بلب ہو گیا دفن بھی
آپ جو چاہتے تھے وہ سب ہو گیا

چاند سورج نثار اس پہ ہونے لگے
جب نمودار ماہِ عرب ہو گیا

لب پہ آئی اِدھر آرزوئے وصال
اور انکار ادھر زیرِ لب ہو گیا

پہلے ہوتا تھا غم گاہے ماہے عدیلؔ
اب تو وہ داخلِ روز و شب ہو گیا





ربطِ نیاز و ناز عجب کام آ گیا
وہ مجھ پہ چھا گئے، میں زمانے پہ چھا گیا

جلوہ تو طور پر وہ بہت کم دکھا گیا
البتہ غش کسی کو زیادہ ہی آ گیا

جنّت سے اک خطا پہ نکالا گیا جسے
کر کے وہی خطا تری دنیا بسا گیا

کہتا نہیں برا تو نہ لڑتے رقیب سے
تم کو برا کہا تو نہ ہم سے رہا گیا

منصور میں جو حق تھا ہوا تھا وہی عیاں
اندھا زمانہ دار پہ حق کو چڑھا گیا

شک ہے کہ چاہتا ہوں کسی اور کو بھی میں
الزام اک نیا وہ مرے سر لگا گیا

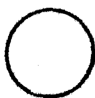
گر اس کے دل میں چور نہیں تھا تو کس لئے
محفل میں ہم کو دیکھ کے نظریں چرا گیا

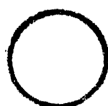
مسجد میں ایک بات تو رندوں میں ایک بات
واعظ گیا جہاں بھی نیا گل کھلا گیا

مجمع میں سارے میرے محلے کے لوگ تھے
وہ کوئی اور تھا جو مرا گھر جلا گیا

آتا نہیں دعا میں اثر اس خیال سے
طعنہ نہ دے فلک کہ وہ پستی میں آ گیا

بندوں سے قرض مانگا جب اللہ نے عدیلؔ
اتنا دیا کسی نے کہ گھر ہی لٹا گیا





واقعاتِ ماسبق سے جب مدلّل ہوگیا
تیس پاروں میں کلام اس کا مکمّل ہوگیا

خونِ دل پی پی کے غم ایسا مبدّل ہوگیا
دیو پیکر، دیو قامت، دیو ہیکل ہوگیا

آبلوں کے گرم پانی سے جھلسنے کے بعوض
حیرت اس پہ ہے کہ لالہ زار جنگل ہوگیا

غیر حاضر ہے کوئی دن سے کسی کی بزم میں
یا تو دشمن جیں بسا یا پھر معطّل ہوگیا

جان لے کر موت اپنے کارنامے پر ہے خوش
اور ہم کو یہ خوشی ہے مسئلہ حل ہوگیا

دیر سے پل پر کھڑا تھا، کرلی آخر خودکشی
دیکھ کر پانی کو پاگل اور پاگل ہوگیا

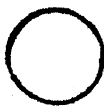
جب کبھی نیند آئی ہے ان کے تصور میں مجھے
کھردرا بستر بھی میرے حق میں مخمل ہوگیا

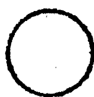
بیچ میں آنا پڑا ہے ساکھ رکھنے موت کو
جب حریفِ آلام کا کربِ مسلسل ہوگیا

ایسا کچھ نقشہ ہے دل کا آپ کے جانے کے بعد
ہیں کھلے غم کے دریچے گھر مقفل ہوگیا

اس نے پانی بھی نہیں مانگا دوا تو اک طرف
جو کسی کی تیر سی پلکوں سے گھایل ہوگیا

لڑ رہے ہیں فتوے دے کر شیخ و ملّا اے عدیل
صحنِ مسجد جیسے کہ اب ایک دنگل ہوگیا





ڈوبنے کے وقت جب سورج کا کر تو فر گیا
انتقاماً اپنی ساری روشنی لے کر گیا

ہم نہ کہتے تھے کہ آئی بے رخی اچھی نہیں
آیئے واپس چلیں گے مرنے والا مر گیا

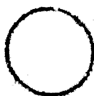
رات کی شرمندگی کو دور کرنے کے لئے
صبح کو سورج اجالا لے کے اک اک گھر گیا

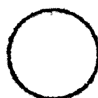
یاد کرتا ہے زمانہ آج تک بھی قیس کو
تھا تو دیوانہ مگر کیا نام پیدا کر گیا

کیا گنہ کے مرتکب آدمؑ ہوئے تھے خود بخود
کس لئے اتنا بڑا الزام ان کے سر گیا

جو کنارے پر کھڑے تھے لڑکھڑا کر رہ گئے
جب کنارے تک میں طوفانوں سے بچ کر گیا

کوئی منظر دیر پا دیکھا نہ دنیا میں عدیلؔ
ایک منظر سامنے آیا تو اک منظر گیا





گزر کے لوح و قلم سے تلاشِ یار میں تھا
میں اک حصار سے نکلا تو اک حصار میں تھا

چمن سے پھول نکلتے ہی انتشار میں تھا
کسی کی قبر پہ تھا یا کسی کے ہار میں تھا

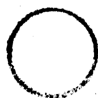
وجود ہو کے فنا گوشۂ مزار میں تھا
طویل قصے کا انجام اختصار میں تھا

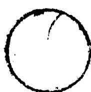
اذاں کی لے میں وہ نغمہ حرم میں گونج گیا
صدا بدل کے جو ناقوس کی پکار میں تھا

اڑان بھر کے ڈھلا ہے جسد میں آدم کے
زمیں کا حسن جو بکھرا ہوا غبار میں تھا

سلگ کے سرمہ ہوا جب سے آنکھ میں ہے
وگرنہ طور تو پتھر تھا کس شمار میں تھا

فضا ہی ایسی تھی کچھ اے عدیلؔ دنیا کی
رہا میں نیند میں یا نیند کے خمار میں تھا





کیا کہیں اُلفت میں کب سے حال خستہ ہو گیا
رفتہ، رفتہ، رفتہ، رفتہ، رفتہ ہو گیا

حکمراں سے ہر کوئی جب دل شکستہ ہو گیا
پھر ہوا ایسا کہ اس کا تخت تختہ ہو گیا

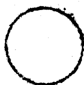
وہ جدھر سے ہو کے گزرے عرش تک معراج میں
ہر فرشتہ سر جھکا کر دست بستہ ہو گیا

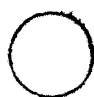
تلخ تھیں یادیں بہت اس کی چلو اچھا ہوا
محو خود ہی ذہن و دل سے عہد رفتہ ہو گیا

کس بنا پر کی تھی موسیٰ نے تمنّا دید کی
اک جھلک ہی دیکھ کر جب ان پہ سکتہ ہو گیا

ڈھونڈنے نزدیک کا رستہ امیر کارواں
اصل رستے سے ہٹا تو دور رستہ ہو گیا

ہے انا منصور کی تو قدر کے قابل عدیل
حق رسی کے واسطے اک اور رستہ ہو گیا





دونوں دل آویز دونوں لاجواب
کمسنی کلیوں کی پھولوں کا شباب

کیوں گناہوں سے کریں ہم اجتناب
زندگی اوّل خراب آخر خراب

کیوں نہ باور ہو کہ ہیں وہ بے نقاب
"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

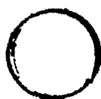
غم کو اپنی زندگی دے کر چلے
سونے والوں نے کھلی رکھ دی کتاب

عشق میں جذبِ زلیخا شرط ہے
آ کے رہتا ہے تیرے سر سے شباب

اے گناہِ اولیں پائندہ باد
ہو رہی ہے آج تک مٹی خراب

جلوہ فرما ہے کوئی دل میں عدیل
کون ہے وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب





غم غلط کرتی ہے انساں کا شراب
یا بڑھا دیتی ہے کچھ اور اضطراب

نیکیوں کے ساتھ اتنا بھی اگئی
ہم ہوئے ہیں نیک لوگوں میں خراب

تجھکو مل سکتی تھی شیریں کوہ کن
کھود کر لائے اگر جوئے شراب

دوڑ کر ہم اور پیاسے ہو گئے
ہو خدا کی مار تجھ پر اے سراب

آسماں ان کو زمیں پر دیکھکر
چیخ اٹھا یٰلیتنی کنت تراب

جتنے گھر تو نے اُجاڑے اے اجل
ان سے بڑھ کر ہو ترا خانہ خراب

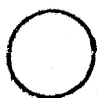
اک اشارہ ہے یہ رندوں کے لئے
الٹو بارش کو تو بنتی ہے شراب

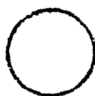
دھوکے اکثر دن میں ہی کھاتے ہیں لوگ
شب کو دنیا میں نہیں ہوتا سراب

شیخ پر کھل جائیں گے چودہ[١٤] طبق
پی لے ساقی کی اگر جھوٹی شراب

جب سمندر سے نکل سکتی نہیں
بے سبب امواج کا ہے اضطراب

کیوں نہ وہ نازاں علیؑ پر ہو عدیل
علم کو ہے علم، ہیں وہ بوتراب





نہ اُٹھ گیا ہو کہیں پردۂ خودی اے دوست
میں اپنے آپ کو پاتا ہوں اجنبی اے دوست

کمال ہے کہ بنائے ہیں دو جہاں جس نے
اسے پسند ہے دل کی شکستگی اے دوست

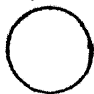
نہ رک سکے گی کبھی رات کی سیاہی سے
سحر کے حصے میں آئی ہے روشنی اے دوست

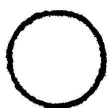
نہ پوچھ حال مرا بات دور جائے گی
گزارتا ہوں بہر حال زندگی اے دوست

تمام عمر جگاتا رہا مقدّر کو!
پھر اس کے بعد مجھے نیند آ گئی اے دوست

اُن آنسوؤں کی قسم ہے ذرا بھی یاد نہیں
کب آ گئی تھی مجھے بھول کر ہنسی اے دوست

عدیلؔ ان کی غلامی پہ ناز کیوں نہ کرے
جنھیں ملی ہے دو عالم کی سروری اے دوست





ہے نئی قسم کی یہ آپ کی اپنائیت
پوچھتے رہتے ہیں غیروں سے مری خیریت

جس کسی میں بھی ہو کچھ جذبۂ انسانیت
دیکھتا ہے وہ مصیبت میں کہاں قومیت

میں نے دنیا کے رویّے کی شکایت کی تھی
کیا کہا آپ سے کیوں بات کو دی اہمیت

جب کرم ٹوٹ کے برسے گا گنہ گاروں پر
حشر میں دیکھتی رہ جائے گی معصومیت

کچھ صفات ایسی ہیں مخصوص ہیں جو حق کے لئے
بندۂ حق میں ضروری نہیں حقانیت

فکرِ عقبیٰ بھی ضروری ہے مگر وقت کہاں
کارِ دنیا ہی میں کچھ کم نہیں مصروفیت

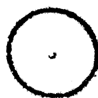
صرف اک شہرِ عدم ایسا ہے سب شہروں میں
بس قدم رکھتے ہی ملتی ہے وہاں شہریت

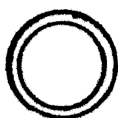
اونٹ کے پیٹھ پہ بھی تِل ہو تو تِل ہی ہوگا
اونٹ پہ چڑھ کے بدلتی نہیں جسمانیت

ایسے اشخاص بھی دنیا میں ہوا کرتے ہیں
جن کی ہوتی ہے خود ان سے بھی بڑی شخصیت

بادۂ اعلیٰ و کہنہ میں بھی وہ کیف کہاں
مستیٔ چشم میں ساقی کی ہے جو کیفیت

طوقِ لعنت بھی ابلیس کی گردن میں عدیلؔ
پھر بھی دنیا میں ہے حاصل اسے مقبولیت





صبح کے ٹھنڈے وقت بھی کتنا پیاسا پیاسا ہے سورج
پھول کے حصے کی شبنم بھی خود پی جاتا ہے سورج

شام نہ ہو مغرور اتنی بھی گر ڈھل جاتا ہے سورج
کیوں ہو اُسے ماضی کا غم جب فاتحِ فردا ہے سورج

چاند نے اپنی بزم سجالی سازش کر کے تاروں سے
اپنے ہوئے بیگانے جب سے تنہا تنہا ہے سورج

کتنے ایسے لوگ ہیں جن کے دن نہیں پھرتے مرنے تک
یا تو غلط ہے دعویٰ گردش یا پھر اندھا ہے سورج

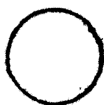
انساں کو انساں کا قاتل دیکھ کے ایسا گرم ہوا!
صدیاں گزریں لیکن اب تک آگ بگولا ہے سورج

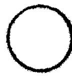
کر دیتا ہے دھوپ سے اپنی ذرّے ذرّے کو روشن
پیکر تو ہے آگ کا لیکن دل کا دریا ہے سورج

زیست کے متوالوں سے کہہ دو فکرِ چراغِ راہ کریں
پھیل رہے ہیں شام کے سائے ڈوبنے والا ہے سورج

رہتا ہے پوشیدہ نظر سے صبح سے پہلے شام کے بعد
اس سے تو ہوتا ہے ثابت وقت کا بندا ہے سورج

سورج کے اوقات سے بڑھ کر ہوگی کوئی بات عدیلؔ
سنتے ہیں اک دن مشرق میں لوٹ کے آیا ہے سورج





وہ جتنی دیر رہے گھر تھا میرا گھر کی طرح
گئے تو گھر وہی لگتا ہے اک کھنڈر کی طرح

نہیں صباحت رخسار ہی سحر کی طرح
ہیں سرخ ڈورے بھی اس آنکھ میں شرر کی طرح

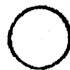
اک ایسا سر بھی تھا تاریخ جس پہ نازاں ہے
جو کلمہ پڑھتا رہا کٹ کے زندہ سر کی طرح

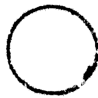
خود اپنے آپ میں جلنے سے فائدہ کیا ہے
جلو اگر تو جلو شمع رہ گزر کی طرح

بھلائے کیسے کوئی اس کا کلمۂ توحید
وہ دل پہ نقش ہے جب نقشِ کالحجر کی طرح

نہیں ہے دھوپ مگر دھوپ کی تپش سی ہے
شبِ فراق تو لگتی ہے دوپہر کی طرح

سفر میں اک بہت آگے ہے اک بہت پیچھے
عدیل خیر نہیں تیز گام شر کی طرح





ہیں حسینوں کے جو آنسو، ہیں کب آنسو کی طرح
کوئی گوہر کی طرح ہے کوئی لولو کی طرح

ہجر جاناں میں رہے موجِ لبِ جو کی طرح
درد کی طرح اٹھے، گر پڑے آنسو کی طرح

جھرّیاں چہرۂ واعظ کی مٹا ڈالی ہیں
شغلِ مے نے تو اسے کر دیا گبرو کی طرح

ہاتھ سے تم کو نہ چھوئیں گے فقط دیکھیں گے
ہم سے کیوں سہمے ہوئے ہو کسی آہو کی طرح

مطمئن کیسے ہو ابرو سے شباہت پہ ہلال
کیوں نہ چاہے کہ ہو خم بھی خمِ ابرو کی طرح

ان کے وعدے پہ ہے موقع تو خوشی کا لیکن
بات کو اپنی بدل دیں نہ وہ پہلو کی طرح

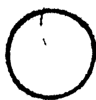
رنگ کی طرح سمجھ لیجئے وابستہ مجھے
ہیں اگر آپ کسی پھول کی خوشبو کی طرح

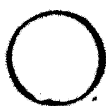
جگمگاتے ہیں مرے اشک شبِ فرقت میں
بھیگی راتوں میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح

شرق تا غرب کہیں جس کا اُتار ابھی نہیں
کوئی جادو نہیں اس آنکھ کے جادو کی طرح

یوں تو ہے دیر و کلیسا میں بھی نعرہ بازی
ایک نعرہ تو لگا دے کوئی یاھُو کی طرح

چپہ چپہ ہے عدیل اس کی عمل داری میں
قیس کے واسطے صحرا ہے قلمرو کی طرح





جب سے ہے میسّر اسے خورشید کی تائید
مغرور ہے ذرّہ کہ ہے وابستۂ خورشید

ہوں لازم و ملزوم بھی گر حسرت و اُمید
اک قابلِ تنقید ہے اک قابلِ تقلید

اللہ کو اللہ کوئی پڑھ ہی نہیں سکتا
ہوتی نہ اگر نام پہ اللہ کے تشدید

دہشت کے سوا کچھ نہیں واعظ کے بیاں میں
ہر جملے میں تنبیہ ہے ہر فقرے میں تہدید

دنیا جسے کہتے ہیں وہ قائم ہے اسی پر
اللہ رے کیا چیز ہے کیا چیز ہے امید

قرآن ہی میں مجھکو یہ خوبی نظر آئی
ہر سورہ میں تقدیم ہے لیکن نہیں تعقید

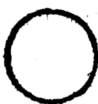
سب مل کے مٹائیں بھی تو غم مٹ نہیں سکتا
حاصل ہے اسے جدِّ بنی نوع کی تائید

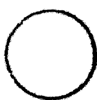
سیّاروں میں کہتے ہیں اسے حسن کی دیوی
معلوم نہیں کیسی حقیقت میں ہے ناہید

شیطان ہے مردود الگ بات ہے لیکن
کوئی بھی نہیں اس سے بڑا قائلِ توحید

تا عمر جنہیں اعضائے مرا خون پیا ہے
محشر میں انہوں نے بھی نہیں کی مری تائید

بیگانگی لوگوں میں عدیلؔ اتنی نہیں تھی
ایسا تو نہیں ہے کہ یہ ہے حشر کی تمہید





ویسے کوئی نزدیک نہیں راہِ خداوند
رکھ دو جو قدم، دور نہیں ہے قدمے چند

آمادہ ہوئے ذبح پہ آنکھوں کو کیے بند
تھے واقعی فرزند براہیم کے فرزند

کیا موت کا بازار نہیں وقت کا پابند
ہر وقت کھلا ہے کبھی ہوتا ہی نہیں بند

نکلی ہے کچھ اس شان سے بارات جنوں کی
آگے ترا دیوانہ ہے پیچھے ہیں خردمند

روکے گا وہاں کون مجھے دادرسی سے
محشر میں بھی کیا آپ کریں گے مرا منہ بند

غصّے میں ہے یہ رنگ تو غصّے ہی میں رہیے
غصّے سے نکھر آیا ہے حسن آپ کا دوچند

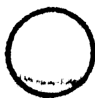
اک پل کبھی آگے ہے نہ اک پل کبھی پیچھے
کیسی ہی سہی موت ہے اوقات کی پابند

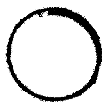
حیرت ہے کہ واعظ میں فرشتوں کی صفت ہے
اطلس میں لگا تا ہے کوئی ٹاٹ کا پیوند

ہو بس میں اگر میرے تو میں وار کے رکھ دوں
خالِ رخِ جاناں پہ بخارا و سمرقند

چہرے کی تمازت میں بشاشت بھی ہے شامل
سرتا بہ قدم آگ ہیں خورشید ہے خورسند

میں منتظر اس کا ہوں کہیں جا نہیں سکتا
رکھا ہے عدیل اس نے مجھے گھر میں نظر بند





سمجھا سکے گا ہم کو وہ کیا خاک نیک و بد
"او خویشتن گم است کرا رہبری کند"

اس مسئلے پہ گنگ سی صدیوں سے ہے خرد
کیا بے نیازِ سایہ بھی ہوتا ہے کوئی قد

غرقاب ہونے والے پگھلتے ہیں اصل میں
کہتے ہیں لوگ اس کو سمندر کا جزر و مد

کچھ نام اپنے آپ ہیں وحدت کے ترجمان
جیسے کہ اک وحید ہے، واحد ہے یا احد

دو دن کی زندگی ہی میں جب ہو گئے نڈھال
کیسے جئیں گے لوگ پسِ مرگ تا ابد

ہم سے وہ بے نیاز نہیں اس کا فضل ہے
گرچہ ہے نام سورۂ اخلاص میں صمد

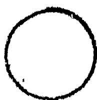
ہو کر بڑا زمیں سے قمر سہہ نہیں سکا
اس پر جو اک زمیں سے لگائی گئی تھی زد

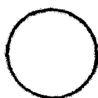
لکھا ہے یوں تو آپ نے خط کو بگاڑ کر
لیکن ہمارے حق میں یہی خط ہے اک سند

ہوتا ہے جن کو نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہ پر یقین
دنیا میں وہ کسی سے نہیں مانگتے مدد

کیڑے ہیں زندہ کس طرح پتھر کے بطن میں
آتی ہے ان کے واسطے کس راہ سے رسد

کھاؤ نہ خوف تم سگِ دنیا سے اے عدیلؔ
مکتا تو ہے اسد کا مگر وہ نہیں اسد





زندہ کرنے کے لئے مردوں کو ہے یوم النشور
پھونک کر طاری کریں وحشت نہ اسرافیل صور

ہے دہکتی آگ پر اپنی جہنم کو غرور
اس نے دیکھا ہی کہاں ہوتا ہے کیا غم کا تنور

کیسے اس کے نور کا ہر آدمی میں ہے ظہور
قاعدے سے جبکہ ممکن ہی نہیں تقسیمِ نور

آسماں وسعت کو جن کی دیکھتا ہے رشک سے
ایک ہے غارِ حرا اور دوسرا ہے غارِ ثور

کیا تشفی ہو سکے گی ہم جلائیں گر چراغ
تجھکو تو جلنے کا چسکا لگ گیا ہے کوہِ طور

طالبانِ حق پڑھو قرآں تو حق کو پاؤ گے
اب نہ وہ توریت باقی ہے نہ انجیل و زبور

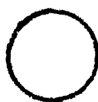
آدمی جس کے سبب گرتا نہیں ہے سطح سے
ایک تو خود ہے شعور اور ایک ہے تحت الشعور

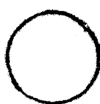
ہیں اُدھر دو نام، اک جبّار اک قہّار ہے
چار ادھر ہیں ارحم و رحمان و غفّار و غفور

خلد میں حوریں نہیں کچھ اور مصرف کے لئے
شیخ نے کچھ اور سمجھا ہے تو ہے ذہنی فتور

عشق میں کب ہے مقرر کوئی معیارِ نظر
سانولی لیلیٰ تھی مجنوں کی نظر میں رشکِ حور

کوئی اپنا گھر نہیں ہوتا چراغوں کا عدیل
روشنی دیتے ہیں چاہے محفلیں ہوں یا قبور





وہ کیا کہیں گے صورتِ بیمار دیکھکر
اندازہ ہے ہر ایک کو آثار دیکھکر

ہم بڑھ رہے تھے جن کو طرفدار دیکھکر
وہ رک گئے زمانے کی رفتار دیکھکر

ان کی نظر بھی ہے سرِ محشر جھکی ہوئی
کچھ ہم بھی چپ ہیں مجمعِ اغیار دیکھکر

طولِ غمِ حیات سے گھبرا گیا تھا میں
لیکن سنبھل گیا نگہِ یار دیکھکر

پروانے اپنے عشق میں ثابت قدم رہے
آنکھوں سے اپنی موت کے آثار دیکھکر

بجلی گرائی طور پہ تو کیا کمال ہے
جلوہ دکھاؤ طاقتِ دیدار دیکھ کر

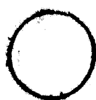
ہم کو کچھ ایسی بار نہ تھی اپنی زندگی
جاں دی ہے صرف موت کا اصرار دیکھ کر

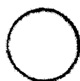
کیسے اٹھے گا حشر نہ سمجھے تھے آج تک
اندازہ ہو گیا تری رفتار دیکھ کر

مڑ کر بھی رہروان عدم دیکھتے نہیں
ایسے چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

میری طرح سے کوئی ہو مغموم کس لئے
دیتے ہیں غم وہ ظرفِ طلبگار دیکھ کر

دنیا کے دل دکھانے کا صدمہ نہیں عدیلؔ
صدمہ ہے ان کو درپئے آزار دیکھ کر





ترپتا رہا ہے یقیناً سحر تک فضا میں کوئی اشک خونیں بہا کر
دگرنہ افق سے نکلتا نہ سورج زسرتا قدم سرخیوں میں نہا کر

ملنسار ہونا تو اچھا ہے لیکن ملنساری اتنی بھی اچھی نہیں ہے
نہ کر جمع لوگوں کو اطراف اپنے جو مخلص ہیں احباب ان میں رہا کر

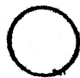
نہ چوما تھا پہلے کسی سیم تن کو یہ ان کے لئے اک نیا تجربہ تھا
مچلتی رہیں دیر تک اس کی موجیں گئے جب کسی جھیل میں وہ نہا کر

گھما کر نہ کہہ بات ہرگز کسی سے نکلتے ہیں مطلب کئی اور اس سے
ہو چاہے وہ اثبات میں یا نفی میں تجھے جو بھی کہنا ہے کھل کر کہا کر

برائی نہ کر ہو جہاں تک بھی ممکن نہیں تو کوئی حد مقرر کر اس کی
بھلائی کی صورت بہت مختلف ہے کئے جا اسے اور بے انتہا کر

بوقت سحر جاگنے کے بجائے رہے نیند میں گر فرائض سے غافل
پرندے نہیں دیکھ سکتے یہ منظر جگاتے ہیں انسان کو چہچہا کر

عدیل اس کا ہوتا ہے حق اس میں کتنا کسان اس طرف سوچتا تک نہیں ہے
وہ خوش ہے کہ لائی ہے رنگ اس کی محنت ہرے کھیت نے داد دی لہلہا کر





چیختے رہتے ہیں دشت و ریگزار
ہے یہ کن بے چین روحوں کی پکار

ہے کچھ ایسی آنسوؤں کی نرم دھار
جیسے ہو برسات کی پہلی پھوار

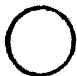
اتنی مدت سے ہوں میں صحرا نشین
مجھ سے گھل مل سی گئی ہرنوں کی ڈار

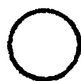
جانتا ہے موت برحق ہے مگر
خود سے کب کرتا ہے کوئی انتظار

ہوگیا گر کر زمیں پر پاش پاش
تھا پہاڑوں تک ہی زورِ آبشار

تشنہ ہوکر بھی ہے ساحل پُرسکوں
موج ہے دریا کو پی کر بے قرار

دوست سے دشمن ہی اچھا ہے عدیل
کم سے کم کرتا نہیں پیچھے سے وار





ہوا ہے اس طرح جلوہ آرا وہ پردہ داری سے تنگ ہو کر
کہیں ہے تاروں کا حسن بن کر کہیں ہے پھولوں کا رنگ ہو کر

حرم کا ماحول ہی الگ ہے یہاں وہ کیسے دکھائی دے گا
بتوں کی صورت میں ڈھل گیا ہے جو حسن تقدیرِ سنگ ہو کر

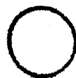
بچاتے کیسے ہم آشیانہ تھی چار تنکوں کی کیا حقیقت
زمیں تک آئے جب ایک بجلی فلک نشینی سے تنگ ہو کر

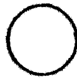
ضیائے عارض چمک رہی ہے لبوں کی سرخی دمک رہی ہے
سحر کے حصے میں نور ہو کر شفق کے حصے میں رنگ ہو کر

وہ پائیں مر کر بھی زندگانی تو کس قدر بدحواس ہوں گے
اجل کو آواز دے رہے ہیں جو زندگانی سے تنگ ہو کر

قریب ہے کچھ دنوں سے غم بھی گلے لگائیں نہ کیوں اسی کو
خوشی نے ہم کو بھلا دیا جب ہمارے دل کی امنگ ہو کر

عدیلؔ جو بات خوفِ جاں سے بڑے بڑے بھی نہ کہنے پائے
کہی ہے وہ بات دار پر بھی کسی نے بے نام و ننگ ہو کر





تاجداروں کے خواب کی تعبیر
سنگِ مرمر کی بن گئی تقدیر

چاند سورج نہ دے سکے تنویر
زندہ باد اے ستارۂ تقدیر

ابنِ آدم ہے فطرتاً دلگیر
اس کو کہتے ہیں خون کی تاثیر

ہے یہی حسن و عشق کی تفسیر
کوئی عالم ہے کوئی عالم گیر

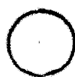
دمِ آخر وہ دیکھنے آئے
سو گئے ہم تو جاگ اٹھی تقدیر

توڑ دیتی ہے کفرِ ظلمت کا
ایک ہلکی سی روشنی کی لکیر

خود بتوں کا سکوت کہتا ہے
گونج اُٹھے گا نعرۂ تکبیر

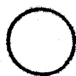
اپنی مرضی سے جی نہیں سکتے
اس کو کہتے ہیں قیدِ بے زنجیر

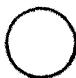
ایک ہے میرا ظاہر و باطن
جس طرح معنئ عدیل و نظیر



قطعہ

کہتے ہیں جس کو لوگ نظیر علی عدیلؔ
دل کا بہت بڑا ہے اگرچہ غریب ہے
رہتا ہے تم سے دور بہت دور وہ مگر
محسوس یوں کرو گے کہ دل سے قریب ہے





کچھ بھی ہو نظمِ میکدہ کوئی ہو انتظام پر
میں بھی ہوں میکدہ نشیں میرا بھی حق ہے جام پر

دیکھیے چل کے اک نظر مہر و وفا کے نام پر
اب تو کسی کی زندگی رہ گئی صبح و شام پر

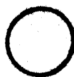
دار پہ چڑھ گیا کوئی لغزشِ ناتمام پر
بات غلط نہ تھی مگر کہہ دی غلط مقام پر

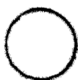
بادہ کشی کے ساتھ ساتھ دیکھ رہا ہوں یہ بھی میں
کس کی نظر ہے آپ پر کس کی نظر ہے جام پر

آپ کے رخ پہ زلف کو دیکھ کے ہم سمجھ گئے
شام کا حق ہے صبح پر صبح کا حق ہے شام پر

شرطِ شعورِ دید ہے وہ نہیں جلوہ گر کہاں
ہٹ کے ہر اک مقام سے رک کے ہر اک مقام پر

ان کے خلاف حشر میں کچھ نہ کہیں گے ہم عدیلؔ
کون کرے گا شرمسار ان کو نئے مقام پر





عدم کے مسافر تو سب ہیں مگر
نہیں ہے کسی کا کوئی ہم سفر

میں روتا نہیں ہوں انہیں دیکھ کر
تمازت سے جلوے کی ہے چشم تر

نہیں وہ کہاں اور کب جلوہ گر
اگر آنکھ میں ہو شعورِ نظر

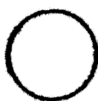
دعا میں خلوصِ دعا ہو اگر!
چلا آئے گا ہاتھ باندھے اثر

جب اس رخ سے گیسو ہٹائے گئے
گلے مل کے بچھڑے ہیں شام و سحر

مرے ڈوبنے تک ہے اس کا وجود
مجھے رحم آتا ہے طوفان پر

نہ ہو کیوں امید آدمی کو عدیل
یہ دنیا ہی قائم ہے امید پر





نہیں تھا جلوہ دکھانے کا کچھ غلط انداز
تمہارے ساتھ تھا موسیٰ وہ حسن کا غماز

بھلاتے کیوں نہیں جب ہم سے کوئی ربط نہیں
ستم ہے اصل میں ان کے لگاؤ کا غماز

بہانے والو! جدائی میں بے دریغ آنسو
کرو کچھ آج سے کل کے لیے بھی پس انداز

پہنچ گیا ہوں وہاں میں بغیر شہپر کے
جہاں سے آگے نہیں جبرئیل کی پرواز

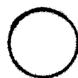
عدم میں کیسے گزاریں گے ہم قیامت کے
برائے نام تو کوئی ہو مونس و دمساز

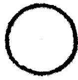
بڑے بڑوں نے بھی قائم کیے ہیں اندازے
کسی پہ کھل نہ سکا آج تک خدا کا راز

کچھ ایسا لگ گیا چسکا گناہِ اوّل کا
زمیں پہ پھینکے گئے بھی تو ہم نہ آئے باز

مذاق اڑاتے ہیں یہ بازی اڑانوں کا
کبوتروں پہ نہ جھپٹے گا کس لیے پھر باز

وفورِ غم میں بھی جو مسکرائے جاتے ہیں
عدیلؔ یہ بھی ہے اک احتجاج کا انداز





قابلِ احترام ہے افلاس
یہ وہ شے ہے نہیں خدا کے پاس

شہر میں تھا گھٹا گھٹا احساس
اس لئے ہم نے لے لیا بَن باس

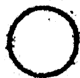
اک زمانے کے بعد ہوتی ہے
آدمی کی نظر زمانہ شناس

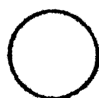
جگمگائے نہ کیسے تاج محل!
سنگِ مرمر میں دفن ہے الماس

اپنی تقدیر کے ستاروں سے
خود ہی واقف نہیں ستارہ شناس

سب سے ملئے مگر بس اک حد تک
ورنہ جاتا ہے دور دور قیاس

عکس در عکس آدمی ہے عدیلؔ
اور ہے عکس روشِ عکاّس





بدلی کب ابلیس نے مردود ہو کر بھی روش
ایسے سرکش کے لئے کافی نہیں یہ سرزنش

کاش ہو جائے کسی دشمن سے ان کی چپقلش
پھر انہیں اندازہ ہو گا کیسی ہوتی ہے خلش

مختلف ہے رند و زاہد کے ستاروں کی روش
ایک ہے آزاد فطرت اور اک صوفی منش

کھینچ لیتی ہے زمیں ہر چیز کو اپنی طرف
ہیں بڑے شمس و قمر لیکن نہیں رکھتے کشش

بدگمانی سے بچے انساں جہاں تک ہو سکے
ہو صفائی لاکھ بھی تو مٹ نہیں سکتی خلش

اک گدا سے بھی گیا گزرا وہ دولت مند ہے
جو نہیں رکھتا ہو دل میں جذبۂ داد و دہش

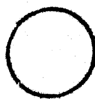
لائی ہے جو حکم نامہ، بعد میں دیکھوں گا میں
موت سے کہہ دو بجا لائے وہ پہلے کورنش

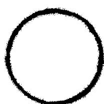
یہ جو رعشہ آخر دم ہے کوئی رعشہ نہیں
اصل میں اعضا گنہ کے خوف سے ہیں مرتعش

کس کو دیکھیں اور دیکھیں بھی تو کتنی دیر تک
سر سے پا تک ہر ادا میں ہے حسینوں کی کشش

ہیں بظاہر دیکھنے میں اُن کے عارض پھول سے
لیکن ان میں دل کو پگھلانے کی پنہاں ہے تپش

جس طرف سے ہو کے گزرے وہ گلستاں میں عدیلؔ
چوم کر قدموں کو ان کے مہکی مہکی ہے روش





چلیے کم ہے وقت، موت و زیست کی ہے کشمکش
آ رہا ہے آپ کے بیمار پر اب غش پہ غش

ابنِ آدم ہو تو ہو پھر کیسے مائل امن پر
ابتدا ہی سے اسے مرغوب ہے جب سنگھرش

رنگ کیوں اہلِ حبش کا جل کے کالا ہو گیا
یہ تو ممکن ہی نہیں، ہو آتشیں خاکِ حبش

ہم تو کہتے تھے لگاؤ منہ نہ تم اغیار کو
سامنے آ کر رہا اس کا نتیجہ آخرش

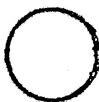
آ گیا لیلیٰ پہ دل مجنوں کا دل پر زور کیا
تھی سلونی سانولی سی وہ نہ تھی کچھ ماہ وش

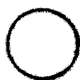
رہ گیا بن کر خلش دل کی نکلتا ہی نہیں
ہائے ان کی تیکھی نظروں کا وہ تیرِ نیم کش

دیکھنے والوں نے دیکھا رو برو ہو کر اسے
جس کے اک پر تو پہ موسیٰ رہ گئے تھے کھا کے غش

جو تقاضے دل کے ہیں ان کا مخالف ہے دماغ
درمیاں دونوں کے ہم ہیں مبتلائے کشمکش

تشنہ لب ایسے بھی اس دنیا میں گزرے ہیں عدیل
تشنگی پہ جن کی دریا چیخ اٹھے العطش





نکالیئے نئے ظلم و ستم کی گنجائش
ابھی ہے اور مرے دل میں غم کی گنجائش

وفا کی راہ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی
ہر اک قدم پہ ہے اور اک قدم کی گنجائش

ہزاروں سال سے آنسو بہائی جاتی ہے
مگر نہ ختم ہوئی چشم نم کی گنجائش

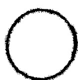
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں آگئے آنسو
چھپی ہوئی تھی خوشی میں بھی غم کی گنجائش

رہے خیال مقدر سنوارنے والے
نہ رہنے پائے کسی پیچ و خم کی گنجائش

ہماری سانس بڑے دکھ کے ساتھ ٹوٹ گئی
ذرا بھی جب نہ رہی زیر و بم کی گنجائش

ہجوم جلوۂ اصنام ہے نظر میں عدیل
مگر ہے دل میں فقط اک صنم کی گنجائش





خوب ہو تم بھی اے بتو شاباش
کر دیا راز پتھروں کا فاش

چاند کتنے زمین پر ہیں دیکھ
نہ اکڑ ایک چاند پر آکاش

پاک بینی خلافِ فطرت ہے
آنکھ خود آدمی کی ہے اوباش

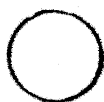
حشر میں مل کے فائدہ کیا ہے
زندگانی میں تم ملو اے کاش

چاہے اندر سے کھوکھلا ہی سہی
ہے مگر شیخ آدمی خوش باش

گود میں بھر لیا ہے تاروں کو
پیرِ گردوں بھی ہے بڑا عیاش

بے حسی ہو جس آدمی میں عدیل
جیتے جی ہے وہ چلتی پھرتی لاش





کی مختلف انداز میں اقوام نے توصیف
حاصل ہے یہ اس کا کہ ہے وہ قابلِ تعریف

کیجے نہ تکلّف نہ مرے واسطے تکلیف
رستے میں مرا گھر ہے کبھی لائیے تشریف

قرآں جسے کہتے ہیں بڑی خاص ہے تصنیف
کرتے ہیں دبے لفظوں میں اغیار بھی تعریف

شوخی بھی ہے اس آنکھ میں، ہے شرم و حیا بھی
یہ قابلِ تعریف ہے وہ قابلِ توصیف

قرآں پہ کیوں نام مصنّف کا نہیں ہے
جب نام مصنّف سے ہیں ساری ہی تصانیف

افزائشِ انساں تو یوں ہی ہوتی رہے گی
ممکن نہیں تا حشر بھی اس میں کوئی تخفیف

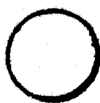
کر دو نظر انداز تو کچھ چیز نہیں ہے
تکلیف کا احساس ہی دراصل ہے تکلیف

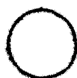
دل جوئی بڑی شے ہے بڑی اس کی جزا ہے
فطرت کا عطا کردہ ہے یہ نسخۂ تالیف

جنت ہی سے تکلیف اٹھاتے ہوئے آئے
دنیا ہی میں درپیش نہیں ہم کو تکالیف

وہ اہلِ قلم قابلِ گردن زدنی ہیں
کرتے ہیں جو موقع سے احادیث میں تحریف

کس طرح عدیلؔ اس کی پذیرائی ہے ممکن
واعظ کے بیاں میں ہو اگر دہشت و تخویف





اُلٹ جائیں گے تیرگی کے طبق
پڑھو قُل اَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَق

ہیں محروم حق سے اگر مستحق
تو ناقص ہے دنیا کا نظم و نسق

نہیں زہد و طاعت کے الفاظ ادق
مگر یاد رہتا نہیں یہ سبق

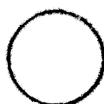
کتابوں سے جو کچھ نہیں سیکھتے
زمانہ پڑھاتا ہے اُن کو سبق

تراشو نئے چاند افکار کے
نہ دیکھو پرانا ہے کتنا اُفق

فقط چاند پر ہی گیا آدمی
نہ پہنچا ابھی وہ طبق در طبق

پسینہ ہے کیا موت کا اے عدیل
گناہوں کی شرمندگی کا عرق





کس آنکھ کو دیدارِ خدا کی نہیں تشویق
لیکن نہیں ہر آنکھ کو دیدار کی توفیق

دیکھے بغیر اللہ کو کرتے ہیں جو تصدیق
ہوتے ہیں بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں صدیق

اللہ سے عطا ہو اگر ایمان کی توفیق
ہو جائے مسلمان بڑے سے بڑا زندیق

دشمن کے تعلق سے وہ کر لے اگر تحقیق
ہو جائے گی پھر خود ہی مری بات کی تصدیق

معراج کی روداد نہیں فہم کے قابل
لیکن ہے یقیں کیونکہ ہے قرآں میں توثیق

کرتا ہے وہ پیدا یہ بناتا ہے مہذّب
ہوتا ہے بڑا باپ سے رتبے میں اتالیق

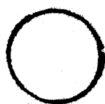
بیمارِ غمِ ہجر کوئی دم کا ہے مہمان
کرنی ہے عیادت تو مناسب نہیں تعویق

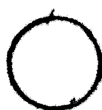
دو چار مجاہد بھی ہیں ان کے لئے کافی
کتنا ہی بڑے سے ہو بڑا لشکرِ زندیق

معصوم فرشتوں نے یہ سوچا بھی نہ ہوگا
ہو جائے گا مردود کبھی ان کا اتالیق

تخلیق تو خلّاق کی ہے اک سے اک اعلیٰ
شہکار مگر ان میں ہے انسان کی تخلیق

ہم لوگ عدم سے چلے آئے یکایک ہی عدم میں
کچھ کر سکے ماحول کی تحقیق نہ تدقیق





بنا علم سے جتنا ابلیس زیرک
ہوا اتنا زعمِ انا میں وہ بوبک

الگ شیخ سے ہے برہمن کا مسلک
مگر چلتی رہتی ہے دونوں میں چشمک

اگر دل میں آجائے انسان کے شک
نکلتا نہیں سانس کے ٹوٹنے تک

لگاؤ نہ اتنا بھی منہ دشمنوں کو!
نہ بیٹھے بٹھائے اُٹھانی پڑے زک

شبِ غم کی تعریف یہ مختصر ہے
بلا ہے بلا بھی نہایت بھیانک

وہ جلتے ہیں خود اپنے سوزِ دروں سے
جلاتا نہیں ہے پتنگوں کو دیپک

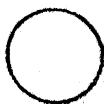
کرشمہ ہے غم میں عجب آنسوؤں کا
بظاہر ہیں گرم اور ان میں ہے ٹھنڈک

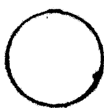
نئی بات کیوں سوجھتی ہی نہیں ہے
کہیں لگ گئی ہو نہ فکروں کو دیمک

گلے سے لگا ہی لیا تھا خوشی کو
خیال آ گیا پھر غموں کا یکایک

کئی دن سے انجان رہنے لگے ہیں
نہیں ان کے ترکش میں کیا کوئی ناوک

بجز حق تعالیٰ کے دونوں جہاں میں
عدیلؔ اور کوئی نہیں ہے تبارک





نہ آئے گا غم میں کبھی وقت نازک
کریں ہم گر اس کا مناسب تدارک

کبھی ہے زمیں کی کبھی آسماں کی !
نہیں شیخ تیری کسی بات میں ٹک

گلاب اتنا کیوں پنکھڑیوں پہ ہے نازاں
دکھا دو ذرا ان کے لب ہائے نازک

نہ بول اتنا واعظ کہ دم چڑھ رہا ہے
درست اپنی سانسوں کو کر لے ذرا ٹک

امارت میں رکھتے ہیں جو وضعداری
غریبی میں بھی وہ بدلتے نہیں ٹک

مجھے دیجیے میں خود گلا کاٹ لوں گا
کہاں وہ تری خنجر کہاں دستِ نازک

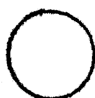
عدو کب ہے سیدھا بہت یہ لگا ہے
ملاؤ نہ تم اس کی تک میں کوئی تک

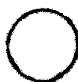
پتنگے فدا تجھ پہ اے شمع ہوں گے
ترا سر ہے جب تک بھی شعلے سے لگ لگ

کبھی چشمِ نرگس جھپکتی نہیں ہے
کسے دیکھتی ہے یہ اس طرح ٹک ٹک

ابھی کر کے سیدھا زمانے کو رکھ دوں
اگر وہ مرے ہاتھ میں دیدے چابک

گناہوں کا عادی نہ ہو جائے انساں
عدیل اس لئے ہے ضروری تدارک





رخ پر ہے مرنے والے کے رنج و محن کا رنگ
یا ہے یہ عمر بھر کی مسلسل تھکن کا رنگ

لگتا ہے وصل و ہجر میں ایسا وطن کا رنگ
جنگل میں جنگل اور چمن میں چمن کا رنگ

الفاظ کے بغیر کوئی ہمکلام ہے
ہے مسکراہٹوں میں سخن در سخن کا رنگ

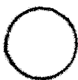
گنگ و جمن کے دیس میں رہنے کے باوجود
آیا نہ رہنے والوں میں گنگ و جمن کا رنگ

چاندی کہاں ہے چاند میں مٹی کا ڈھیر ہے
یہ تو ہے چاندنی میں کسی سیم تن کا رنگ

کھلتی ہے آنکھ دیکھے بغیر اس کو خود بخود
اللہ رے یہ صبح کی پہلی کرن کا رنگ

آنچ آ سکی نہ حرمت یوسف پہ اے عدیل
بدلا ہے چاک ہو کے بھی کب پیرہن کا رنگ





جب ڈھونڈنے اس کا در گئے ہم
در تو نہ ملا بکھر گئے ہم

سب سمجھے یہی کہ مر گئے ہم
دن ڈھلنے لگا تھا گھر گئے ہم

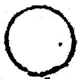
بچھڑی نہ کسی کی یاد ہم سے
ہمراہ رہی جدھر گئے ہم

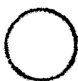
بچوں نے بلک کے جب صدا دی
رستے سے پلٹ کے گھر گئے ہم

کر لو گے ہمارا کیا فرشتو
بالفرض اگر مکر گئے ہم

ویسے ہے ہمارا جام خالی
کتنوں ہی کے جام بھر گئے ہم

تشبیہا یا عدیل یوں اجل کو !
ان کی ہر ادا پہ مر گئے ہم





بخشش کے واسطے کئی آسانیاں بھی ہیں
رحمت بھی ہے ہماری پشیمانیاں بھی ہیں

ویسے تو زندگی میں پریشانیاں بھی ہیں
ماں کی دعا ہو ساتھ تو آسانیاں بھی ہیں

آنچل ہے رخ پہ پھر بھی ہیں نظریں جھکی ہوئی
یعنی حیا میں ان کی پشیمانیاں بھی ہیں

غم دو حروف کا ہے مگر مختصر نہیں
اس میں کہانیوں کی سی طولانیاں بھی ہیں

گل بننے کو اتارتی ہے پیرہن کلی
دوشیزگی کی آڑ میں عریانیاں بھی ہیں

قیمت تو اتنی ہے کہ چکائی نہ جا سکے
بازار میں ہو حسن تو ارزانیاں بھی ہیں

دانائی دشمنوں کی ہے اپنی جگہ عدیل
بربادیوں میں دوست کی نادانیاں بھی ہیں





اک نیا ہے باب یہ تاریخ کے ابواب میں
بچ گئے ہم دشمنوں سے لٹ گئے احباب میں

ہونے دو دشمن کو شامل حلقۂ احباب میں
ایک قطرے کی حقیقت کیا ہے اک تالاب میں

آنکھ سے نکھری ہوئی سی آنسوؤں میں ڈوب کر
اس سفینے کا مقدر جاگ اٹھا سیلاب میں

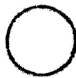
عکسِ رخ ہے جام میں بھی جام کے اطراف بھی
منظر ایسا ہے کہ جیسے جام ہو مہتاب میں

بات تو جب ہے کہ آنکھوں میں اک آنسو بھی نہ ہو
ضبطِ غم پہلا ادب ہے عشق کے آداب میں

روزِ اوّل سے لٹاتا آ رہا ہے روشنی
پھر بھی فرق آیا نہ کچھ سورج کی آب و تاب میں

اس طرح ہم نے شبِ وعدہ گزاری اے عدیل
شمع اس محراب سے رکھ دی ہے اس محراب میں





کبھی بہشت کے دن ایسے یاد آتے ہیں
ہم اپنی خاک نشینی کو بھول جاتے ہیں

خمارِ چشم کو وہ نیند سے چھپاتے ہیں
مگر جو تاڑنے والے ہیں تاڑ جاتے ہیں

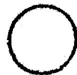
کسی خیال میں گم ہو کے مسکراتے ہیں
مرے جنون کو وہ آئینہ دکھاتے ہیں

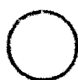
ہمارے رونے سے اٹھیں گی انگلیاں تم پر
ہم اس خیال سے غم میں بھی مسکراتے ہیں

نہیں ہے اصل میں پت جھڑ یہ زرد پتوں کی
شجر بہار کے رستے میں زر بچھاتے ہیں

کچھ ان پہ شب کی سیاہی تو جم نہیں جاتی
سویرے اوس میں کیوں برگ گل نہاتے ہیں

وہ ہم کو دیکھ کے دنیا کو دیکھتے ہیں عدیل
ہم ان کو دیکھ کے دنیا کو بھول جاتے ہیں





اس پر بھی کبھی غور کر اے گردشِ دوراں
ہم اپنی خوشی سے تو نہیں بے سر و ساماں

ہیں یوں ہی ترے ہونٹ تبسم سے گریزاں
یا دیکھ لیا تو نے مرا حالِ پریشاں

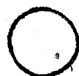
آنکھیں نہیں دیدار کے آداب سے واقف
ورنہ نہیں آنکھوں سے بہت دور رگِ جاں

کیا جانیئے کیا مصلحت اس میں ہے خدا کی
مالک تو ہے سب کا، نہیں سب کیلئے یکساں

سورج کو پچھاڑا ہے سرِ شام افق میں
کیوں رات خوشی میں نہ کرے جشنِ چراغاں

غم خواریٔ حالات کی اُمید تھی جن سے
وہ ہم سے زیادہ نظر آتے ہیں پریشاں

ہرنوں نے عدیلؔ اس کو بڑے پیار سے دیکھا
صحرا میں جب آیا ہے کوئی چاک گریباں





گھبراتے ہیں وہ جب بھی دل کی فضائے غم میں
آب و ہوا بدلتے رہتے ہیں چشمِ نم میں

اُبھرے تو کیسے اُبھرے طاعت کا جذبہ ہم میں
دینا ہے اس جنم میں لینا ہے اس جنم میں

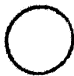
ہیں فرض کے برابر دنیا میں بعض رسمیں
ہے گریہ و تبسّم جیسے نشاط و غم میں

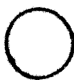
جب واقعی نہیں ہے کچھ ربط آپ ہم میں
تردید کیوں ہے اس کی کھا کر خدا کی قسمیں

ویراں دلوں کے حق میں ہے ہر مقام یکساں
چاہے رہیں کھنڈر میں چاہے رہیں ارم میں

اللہ کی شفقتوں میں ہے یہ عجیب شفقت
بھولا اگر خوشی میں آتا ہے یاد غم میں

ہوں گر عدیلِ عصیاں بڑھ کر سمندروں سے
رہ جائیں غرق ہو کر اک قطرۂ کرم میں





غیروں میں نہیں چاہنے والوں میں لٹے ہیں
لٹتا تھا اندھیروں میں اجالوں میں لٹے ہیں

مانا کہ ہم احباب کی چالوں میں لٹے ہیں
لیکن یہ خوشی ہے کہ جیالوں میں لٹے ہیں

سورج نہ کہے کل کہ وہ واقف نہیں ہم سے
اس واسطے سورج کے اجالوں میں لٹے ہیں

رکھا نہ کہیں کا بھی ہمیں دیدہ و دل نے
مکڑی کی طرح اپنے ہی جالوں میں لٹے ہیں

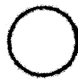
باتوں میں بتا دیں انہیں دل کی کئی باتیں
آوازمیں گم ہو کے سوالوں میں لٹے ہیں

پابندِ مقامات تباہی نہیں ہوتی
ہیں کتنے ہی ایسے جو شوالوں میں لٹے ہیں

یہ غم نہیں دنیا نے ہمیں لوٹ لیا ہے
غم یہ ہے کہ تقدیر کی ڈھالوں میں لٹے ہیں

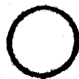
محفوظ نہ پاکر حرم و دیر میں خود کو
میخانہ میں آئے تو پیالوں میں لٹے ہیں

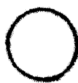
سمجھا تھا جنہیں دوست وہ ثابت ہوئے دشمن
ہم لوگ عدیلؔ اپنے خیالوں میں لٹے ہیں



قطعہ

کیا زر و مال اور کیا عزّت
بے حقیقت سی کائناتیں ہیں
زندہ رہنے کی پہلے کوشش کر
زندگی ہے تو ساری باتیں ہیں





ہر ایک چہرے پہ سو سو طرح کا شک ہے میاں
تمہارے گاؤں میں بھی شہر کی جھلک ہے میاں

اس آفتاب میں کیا ہے بس اک چمک ہے میاں
چمک بھی ایسی جو شکل سے شام تک ہے میاں

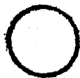
وہ پہلی آنکھ کا سیلاب آج تک ہے میاں
کہ آنسوؤں کا تسلسل پلک پلک ہے میاں

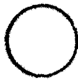
ہو کیسے پھول کی مانند بے حجاب کلی
ابھی تو آنکھ کھلی ہے ابھی جھجک ہے میاں

مجھے نکال کے پچھتائیں گے چمن والے
ہر ایک گل میں مرے خون کی مہک ہے میاں

ہنسی اڑائی تھی شاید کسی کے زخموں کی
صدی صدی سے سمندر نمک نمک ہے میاں

بہت سنبھل کے گزرنا عدیلؔ دنیا سے
قدم قدم پہ یہ ٹوٹی ہوئی سڑک ہے میاں





تم ہی تم ہو جلوہ افگن
صحرا صحرا گلشن گلشن

ہم سے بہاریں ہم سے گلشن
اور ہمارا خالی دامن

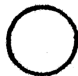
کتنی تڑپ ہے پروانوں میں
شمع ہوئی ہے یہ دیکھ کے روشن

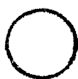
ہائے کلی کی عمر ہی کیا ہے
حسرتِ گل میں چاک ہے دامن

ساتھ ہے حسن و عشق کا مشکل
ایک نہ ہوں گے شیشہ و آہن

لوٹ رہی ہے آگ میں بجلی
مقصد کیا ہے ایک نشیمن

سچ ہے عدیلؔ ارشادِ جگرؔ کا
"دل سا دوست نہ دل سا دشمن"





جب بھی جانبِ منزل ہم قدم بڑھاتے ہیں
حادثات ہٹ ہٹ کر راستہ بناتے ہیں

آشیاں بلندی پر اس لئے بناتے ہیں
فاصلے کی زحمت سے برق کو بچاتے ہیں

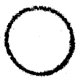
اپنی راہ سے پتھر جب بھی ہم ہٹاتے ہیں
آنکھ میں کئی چہرے گھوم گھوم جاتے ہیں

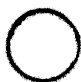
جب پہنچ نہیں سکتی روشنی مزاروں میں
پھر دیئے مزاروں پر لوگ کیوں جلاتے ہیں

وسعتِ دو عالم میں جو سما نہیں سکتے
کس طرح تعجب ہے دل میں وہ سماتے ہیں

دعویٰ انا کیا ہے فکر کی بلندی ہے
اور اس بلندی کو پانے والے پاتے ہیں

موت و زندگی گویا شغل ہے عدیل ان کا
نقش ایک بناتے ہیں نقش اک مٹاتے ہیں





اس میں ہے اس کا قیام اہلِ نظر کہتے ہیں
دل کو اس واسطے اللہ کا گھر کہتے ہیں

عرش پہ جا کے اسے دیکھنا آسان نہ تھا
آنکھ والے اسے توفیقِ نظر کہتے ہیں

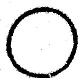
تازگی ہی نہیں ہوتی ہے شجر کی پہچان
وہ اگر سوکھ بھی جائے تو شجر کہتے ہیں

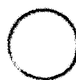
روشنی ہوتی ہے جگنو کے بدن میں جس سے
اصطلاحاً اسے بے سوز شرر کہتے ہیں

یہ تو سچ ہے کہ ہے وہ خاک کا پیکر لیکن
نائبِ اللہ کا ہے جس کو بشر کہتے ہیں

آؤ دنیا میں کریں خلد بریں کی باتیں
قصے کچھ گھر کے بھی دورانِ سفر کہتے ہیں

ہے یہ تشبیہ ذرا قابلِ تحقیق عدیل
زلف و رخسار کو کیوں شام و سحر کہتے ہیں





کہنے والے ترے عارض کو کنول کہتے ہیں
ہم اسے دیکھ کے نظروں ہی غزل کہتے ہیں

اپنے ہمراہ لئے جاتے ہیں مرنے والے
ایک ہی چیز جسے فردِ عمل کہتے ہیں

جس کو اپنا نہ کہا عمر بھر اس کے نہ ہوئے
آپ جو بات بھی کہتے ہیں اٹل کہتے ہیں

حضرتِ شیخ مسائل سے تو واقف ہیں مگر
وہی غائب ہے جسے ذوقِ عمل کہتے ہیں

جس کا ممنونِ کرم امن و اماں ہوتا ہے
ہم حقارت سے اسے جنگ و جدل کہتے ہیں

یادِ محبوب اگر شکل میں ڈھل جاتی ہے
دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں

آپ کہہ دیجیے حریفانِ سخن سے یہ عدیلؔ
جو سخنور ہیں وہ اس طرح غزل کہتے ہیں





بات اتنی ہے کہ مجھ کو مانگنا آیا نہیں
اس لئے آگے کسی کے ہاتھ پھیلایا نہیں

دل کو بہلانے کا جو ساماں ہے وہ پایا نہیں
اس لئے بیساکھیوں سے دل کو بہلایا نہیں

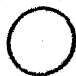
پھر نہ کہنا ہم نے تم کو کھل کے سمجھایا نہیں
وقت کا کیا ہے تقاضہ اب بھی سمجھا یا نہیں

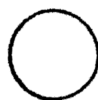
خود خدا کو بھی کسی کا واسطہ درکار ہے
ورنہ اس پر خود بخود ایماں کوئی لایا نہیں

دن کٹھن سے بھی کٹھن گزرے یہاں انسان کے
پھر بھی دنیا سے کبھی مرنے تک اُکتایا نہیں

سایہ و قد لازم و ملزوم ہوں تو ہوں مگر
ایک قد ایسا ہے جس کا واقعی سایا نہیں

چاند سورج کیلئے تو ہے گہن لازم عدیلؔ
ماہ یہ کیسا عرب کا تھا جو گہنایا نہیں!





آنکھ میں آنسو نہیں لب پر گلے شکوے نہیں
عام لوگوں کی طرح ہم چاہنے والے نہیں

دیکھنے والے تھے جب تک وہ نظر آئے نہیں
اب نظر آنے لگے تو دیکھنے والے نہیں

دیکھتے ہیں آپ کے سب طور ہم اندھے نہیں
یہ الگ ہے بات اپنے منہ سے کچھ کہتے نہیں

آنے والے ان کے جلووں میں ایسے گم سنبھلے نہیں
لوٹ کر بھی ان کی محفل سے ابھی لوٹے نہیں

عیب پوشی کر کے اس نے لاج رکھ لی حشر میں
جو گناہ چھپ کر کیے تھے ہم نے وہ پوچھے نہیں

جو بھی دیکھیں گے کریں گے اس پر اظہارِ خیال
ہم زمانے کی طرح اندھے نہیں گونگے نہیں

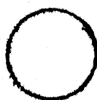
اے لحد رہتا ہے تن کا ہوش کب مرنے کے بعد
لیکن آئے ہیں پہن کر ہم کفن ننگے نہیں

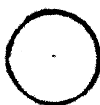
اور تو کچھ بھی نہیں ہے بس سمجھ کا پھیر ہے
وہ نہیں سمجھے ہمیں یا ہم انہیں سمجھے نہیں

کیوں مرے دشمن کئی دن سے بہت خاموش ہیں
کیا شرافت آگئی ہے یا نئے حربے نہیں

طور کی چوٹی ہی پر غش کھا کے موسیٰ گر پڑے
وہ تو کہیے خیر گزری طور سے لڑھکے نہیں

دشمن ان کے بل پہ اتنا سخت ہے ورنہ عدیل
اس کے اچھے بھی ہمارے آگے ٹک سکتے نہیں





جہاں میں کون ہے جو احتیاج مند نہیں
ہیں زیرِ سطح ہی سب، سطح سے بلند نہیں

ہماری آہ کی پرواز کم بلند نہیں
درِ اثر کو بھی پالے گی گر وہ بند نہیں

قرینِ عقل ہو کیسے سبک روی اس کی
براق ہونے کو جو پا یہ ہے سمند نہیں

نہ پوچھو نام ہاگناؤں میں نام کس کس کا
جہاں میں میرے مخالف کئی ہیں چند نہیں

نہ کر غرورِ عبادت یہ بھول کر زاہد
یہی وہ شے ہے جو اللہ کو پسند نہیں

تمہاری فکر و نظر کا مذاق اڑے نہ کہیں
ہمارا حال سزاوارِ زہر خند نہیں

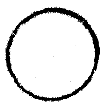
کمی گناہ پہ مقرر ثواب نیکی کا !
خدا کا شکر بدی کی سزا دو چند نہیں

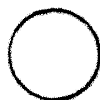
گزارتا ہے عدم میں تو ایک کروٹ پر
سمجھ رہے تھے یہاں کوئی قید و بند نہیں

سبب کچھ اور ہے جو کھوئے کھوئے رہتے ہیں
ہمارے واسطے وہ اتنے فکر مند نہیں

ہم آسماں پہ بہ آسانی چڑھ تو سکتے ہیں
مگر ہے اک یہی مشکل کوئی کمند نہیں

عدیل چاہے کسی شے میں لاکھ خوبی ہو !
انہیں پسند نہیں تو ہمیں پسند نہیں





صبح شبنم میں نہانے سے تر و تازہ نہیں
شب میں کیا کیا گل کھلائے گل نے اندازہ نہیں

دار پر پہنچاتی ہے جو خاص ہے وہ بے خودی
بے خودی ہر قسم کی پابندِ خمیازہ نہیں

کتنے غم اس نے دیئے ہیں کتنے غم ہم سہہ گئے
وہ بھی خود واقف نہیں ہم کو بھی اندازہ نہیں

جو کچھ کرتے ہیں ذاتی فعل اپنا جان کر
کیا سمجھتے ہیں وہ اس کا کوئی خمیازہ نہیں

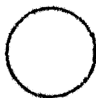
مرنے والوں کا ہے گھر وہ ، قبر کہتے ہیں جسے
ہاں مگر اک ایسا گھر ہے جس کو دروازہ نہیں

اللہ اللہ ان کا غم بھی کیا کرشمہ ساز ہے
لگتا ہے تازہ بہ تازہ گرچہ وہ تازہ نہیں

غم ہے اس دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرا ہوا
ہاں مگر بکھرا ہوا اِس الم کا شیرازہ نہیں

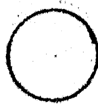
اک سمندر کے برابر ہوں گے تو ہوں گے گناہ
اس کی رحمت کتنی ہے کچھ اس کا اندازہ نہیں

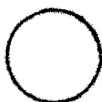
صبح کے رخسار پر ہے جو سفیدی اے عدیل
رنگ بے شک اس کا اصلی ہے کوئی غازہ نہیں



قطعہ

اگر اپنے قبضے میں دنیا رہے گی
تو پھر کب کسی شے کی پروا رہے گی
جو چاہیں گے ہم سب اگر وہ ہوتا رہے گا
خدا کی ضرورت ہی پھر کیا رہے گی





تمہارے رویّے پہ حیرت نہیں
وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں

یہ کیا اس کے جلوے کی ندرت نہیں
نہیں کوئی جو محوِ حیرت نہیں

مرے بچنے کی کوئی صورت نہیں
اب آنے کی ان کو ضرورت نہیں

نہ ہو جب محبّت کا کوئی ثبوت
یقیں کیسے آئے کہ نفرت نہیں

نہ آئے گی چھپ چھپ کے پھر کیوں اجل
دکھانے کے لائق ہی صورت نہیں

مرے دل میں بھی جلوۂ طور ہے
مگر طور کی طرح شہرت نہیں

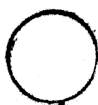
نہیں مرنے والوں میں ایسا کوئی
جسے زندہ رہنے کی حسرت نہیں

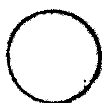
اگر ہو نہ توفیق اللہ کی!
نگاہوں کے بس کی بصیرت نہیں

ابابیل بھجوا کے دے دی شکست
تعین میں اللہ کی نصرت نہیں

شگفتہ ہے کیچڑ میں کھل کر کنول
لہو گندہ ہے گندہ فطرت نہیں

انہیں دیکھ کر رو دیئے ہم عدیلؔ
مسرت کا حاصل مسرت نہیں





ملے بھی وہ ہم سے تو ایسے ملے ہیں
کلی کی طرح سمٹے سمٹے کھلے ہیں

اچانک جو برسوں کے بچھڑے ملے ہیں
نہ کچھ کہہ سکے وہ فقط لب ہلے ہیں

مرے دوست کیا دشمنوں سے ملے ہیں
پرانے شجر میں نئے گل کھلے ہیں

بہت کچھ ہے محفل میں کہنے کو لیکن
مرے ہونٹ تارِ نظر سے سلے ہیں

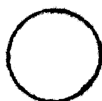
پتہ دیتی ہے ہڈیوں کی صفائی
سلیقے سے اجسامِ مردہ چھلے ہیں

محبت میں دونوں کا عالم ہے یکساں
اُدھر کچھ ہیں شکوے اِدھر کچھ گلے ہیں

نشیمن جلا تو ہوا دینے اس کو
وہ پتّے بھی جن پر تھا تکیہ ہلے ہیں

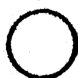
مری آہ سے ہل گئے کوہ تک بھی
مگر کب وہ اپنی جگہ سے ملے ہیں

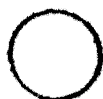
نہیں صرف میرے وطن ہی میں غربت
عدیلؔ اس کے ہر ملک میں سلسلے ہیں



قطعہ

کچھ نہ پوچھو تماشے کیا ہوتے
نا رَوا کام سب رَوا ہوتے
بندگی میں یہ حال ہے اپنا
کیا نہ کرتے اگر خدا ہوتے





موت کو بھی زوال ہے کہ نہیں
ایسی کوئی مثال ہے کہ نہیں

کیوں محبت ہے خود سے انساں کو
اس میں تیرا جمال ہے کہ نہیں

پھول بن کر کلی کلی نہ رہی!
وضعداری محال ہے کہ نہیں

غم میں آنسو بہائے جاتے ہیں
مسکرانا کمال ہے کہ نہیں

میرے مرنے کا غم ہے دنیا کو
آپ کو بھی ملال ہے کہ نہیں

پہلے خود جل کے شمع ہے دلگیر
یہ وفا کی مثال ہے کہ نہیں !

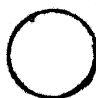
منہ سے کہنا ہی کیا ضروری ہے
میری صورت سوال ہے کہ نہیں

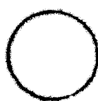
جلوہ گر ہے جگہ جگہ کوئی !
پردہ داری محال ہے کہ نہیں

کون پوچھے یہ مرنے والوں سے
موت بھی حسبِ حال ہے کہ نہیں

مل چکے ہیں ازل میں ہم دونوں
کچھ تمہیں بھی خیال ہے کہ نہیں

ان کو اپنا سمجھ رہا ہوں عدیل
ایک اچھا خیال ہے کہ نہیں





ایسا بھی انقلاب کسی روز کاش ہو
عزت زردوں کی دولت و زر کی تلاش ہو

بے فکر کر اب ایسی جگہ بود و باش ہو
ان کو ملوں نہ میں مری گھر گھر تلاش ہو

جو میرے دل میں ہے وہ ترے دل پہ کاش ہو
بن جائے بات اور کسی پر نہ فاش ہو

بیمارِ غم کو دیکھ کے منہ بن گیا ہے کیوں
کیا چاہتے ہو تم کہ وہ صاحب فراش ہو

واعظ سنیں گے ہم تری باتوں کو غور سے
لہجہ اگر ترا نہ سماعت خراش ہو

اترے اثر دعا میں ذرا احتیاط سے
گر گر زمیں پر نہ کہیں پاش پاش ہو

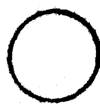
ہم آئے ہیں عدم سے ہی لیکن نہیں قبول
دوبارہ پھر ہماری وہاں بود و باش ہو

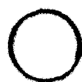
گونگے بتوں کے سامنے گونگا وہ خود بھی ہے
آذر ہو یا کہ اور کوئی بت تراش ہو

جو ہیں برے وہ کچھ بھی نہیں اس کے سامنے
پردے میں رکھ رکھاؤ کے جو بد قماش ہو

خطرہ ہے اس سے بڑھتی ہوئی عمر کے لئے
ہلکا بھی ہاتھ پانو میں گر ارتعاش ہو

بچتا زمیں کی بھوک سے ممکن نہیں عدیل
تابوت آہنی میں بھی گر کوئی لاش ہو





دل کے آگے نہیں کوئی رستہ
جیسے کوئی گلی ہو سربستہ

کیا ملا تم سے ہو کے وابستہ
آنکھ ویراں ہے اور دل خستہ

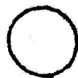
قدرِ فن کار فن سے بڑھ کر ہے
سایہ لمبا ہے اور قد پستہ

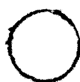
جن کو لایا بچا کے مقتل سے
ہیں مرے قتل پر کمر بستہ

دار سے ہو کے جائیے حق تک
ہے نہایت قریب کا رستہ

آفتابی نظر تو لے آؤ
ذرّہ ذرّہ ہے رازِ سربستہ

ہم عدم تا عدم چلے تھے عدیلؔ
زندگی نے بدل دیا رستہ





دنیا کو میرا شکوہ سنانے سے فائدہ
جانے بھی دیجیے بات بڑھانے سے فائدہ

احساں برائے نام جتانے سے فائدہ
جب ہم نہ ہوں گے آپ کے آنے سے فائدہ

ہر شے سے تیرے حسن کا اندازہ ہو گیا
صورت برائے نام چھپانے سے فائدہ

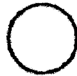
آنسو بہائیے نہ مجھے دیکھ دیکھ کر
میرا فسانہ مجھ کو سنانے سے فائدہ

جاتا تھا میرے دل سے تو کیوں داغ دے گئے
ویرانے میں چراغ جلانے سے فائدہ

اشکوں کی طرح نرم روی اختیار کر
اے آبشار شور مچانے سے فائدہ

بندہ نواز کیا کوئی بیگانہ ہے عدیل
اپنے ہی آدمی کو ستانے سے فائدہ





ان کے جلوے سے آنکھ پرنم ہے
دھوپ کے ساتھ ساتھ شبنم ہے

آشنائے حقیقتِ غم ہے
یہی شاید خطائے آدم ہے

جل کے پروانے سوچتے ہوں گے
کیا زمیں پر بھی اک جہنم ہے

فکر ہے کیسے حق ادا ہوگا !
غم زیادہ ہے ، زندگی کم ہے

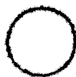
دل سماتا نہیں دوعالم میں
دل میں گنجائشِ دوعالم ہے

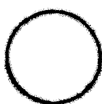
جس کو مانگا ہے رو کے شبنم نے
وہ اُجالا حریفِ شبنم ہے

دل دھڑکتا ہے آخر دم تک
زندگی اضطرابِ پیہم ہے

اور کچھ مقصدِ گناہ نہیں
صرف اک اتباعِ آدم ہے

تیری خاطر مریضِ غم ہے عدیلؔ
ورنہ وہ خود بھی ابنِ مریمؑ ہے





غم سے گھبرا کے اگر چہرے ہمارے اترے
حوصلہ دینے امیدوں کے سہارے اترے

جب کبھی ٹوٹ کے گردوں سے ستارے اترے
میں یہ سمجھا مری نظروں کے اتارے اترے

یادِ جاناں کی تپش سے نکل آئے آنسو
دھوپ سی دھوپ میں پلکوں پہ ستارے اترے

اس لئے آئے یہاں ہم کہ وہاں دل نہ لگا
خود اتر آئے کسی کے نہ اتارے اترے

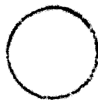
بڑھ گئے آگے کئی لوگ جہاں سے بچ کر
ہم وہاں دیکھنے دل سوز نظارے اترے

ہم کو طوفان نے دیکھا ہے بڑی حسرت سے
اس سے جب بچ کے سمندر کے کنارے اترے

ایک خیمہ نظر آیا تھا مگر خالی تھا
ہم جب اڑتے ہوئے یادوں کے کنارے اترے

فاصلہ پاٹ دیا جھیل نے اک صحرا میں
وہ بھی ٹھنڈک کے لئے ساتھ ہمارے اترے

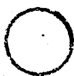
دشت و کہسار اترنے کی جگہ کب ہے عدیل
قیس و فرہاد تو تقدیر کے مارے اترے



قطعہ

ترے کھلنے پہ دل اے غنچہ تو جلتا ہے
جب سے مرجھانا مقدر ہے تو کیوں کھلتا ہے
غنچہ بولا کہ غنیمت ہے گھڑی بھی کھل تو گیا
ورنہ دنیا میں یہ موقع بھی کیسے ملتا ہے





وقت و حالات سے دیرینہ مرا جھگڑا ہے
آپ کو بیچ میں آنے کی ضرورت کیا ہے

جانتا ہوں میں دعاؤں کی حقیقت کیا ہے
میں نے خوش کرنے تجھے ہاتھ اٹھا رکھا ہے

روشنی دیکھنے والوں نے یہ کب سوچا ہے
صبح نے کتنے ستاروں کا گلا گھونٹا ہے

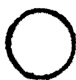
دے کے اک چہرہ مجھے تو نے کہاں بھیجا ہے
ہر بدن پر یہاں ہر روز نیا چہرا ہے

تم مرے گاؤں میں چل کر تو رہو کچھ دن تک
خود ہی اندازہ لگا لوگے محبت کیا ہے

دوستوں کی طرح حملہ نہیں کرتا چھپ کر
ظرف دشمن کا حقیقت میں بہت اونچا ہے

ترس آتا ہے مجھے قسمتِ ساحل پہ عدیلؔ
اس کے قدموں میں سمندر ہے مگر پیاسا ہے





وہ خوشی رشکِ عید ہوتی ہے
جو خلافِ امید ہوتی ہے

اس طرح کچھ امید ہوتی ہے
جیسے حبل الورید ہوتی ہے

ہو محبت تو کم نہیں ہوتی
بلکہ ہل من مزید ہوتی ہے

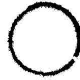
جانتی ہی نہیں نتائج کو
کتنی معصوم امید ہوتی ہے

تیرگی بھی ہے قدر کے قابل
روشنی کی نوید ہوتی ہے

ہائے انساں کو وقتِ آخر بھی
زندگی کی امید ہوتی ہے

بعض اوقات مصلحت بھی عدیلؔ
مصلحت سے بعید ہوتی ہے





اے دوست کہیں اس لئے پردا تو نہیں ہے
پردے میں ترا حال بھی مجھ سا تو نہیں ہے

اخلاص کچھ احباب کا بے جا تو نہیں ہے
دھوکہ یہی ہوتا ہے کہ دھوکا تو نہیں ہے

کلیوں کے تبسم میں ہے کیوں ایک جھجک سی
پیشِ نظر اندیشۂ فردا تو نہیں ہے

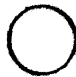
آجائے اگر موت تو مرنا ہی پڑے گا
خود سے کبھی مرنے کا ارادا تو نہیں ہے

رستے ہوئے جھرنوں میں یہ پانی ہے کہاں کا
سینے میں زمیں کے کوئی چھالا تو نہیں ہے

کرتے ہیں جہاں شمس و قمر ڈوب کے سجدے
تیرا ہی وہاں نقشِ کفِ پا تو نہیں ہے

دیکھا تھا عدیل اس نے کسی اور نظر سے
کچھ اور میں سمجھا کہیں ایسا تو نہیں ہے





دنیا بسا کے مجھکو کیا فائدہ ہوا ہے
اک دل عطا ہوا ہے وہ بھی دکھا ہوا ہے

کیا کہیے کیا ہوا ہے جب وہ جدا ہوا ہے
محشر یہ طنز کر کے محشر بپا ہوا ہے

موقع ہے دیکھ لیجے اپنے مریضِ غم کو
دنیا کی رسم بھی ہے دم بھی رکا ہوا ہے

کچھ دور چھوڑنے کو آنکھوں تک آئے آنسو
جب ضبطِ غم بہ مشکل دل سے جدا ہوا ہے

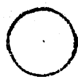
زیرِ نظر رکھا ہے ہر وقت آسماں نے
شاید زمیں سے کوئی خدشہ لگا ہوا ہے

ساحل پہ آ کے موجیں کیوں سر پٹک رہی ہیں
طوفان میں سفینہ کس کا گھرا ہوا ہے

پلکوں پہ جمع ہو کر آنسو اُبل پڑے ہیں
ساحل کے مشورے سے طوفاں بپا ہوا ہے

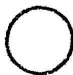
اے طور پھر ہو روشن ورنہ ہنسی اُڑے گی
کس کا چراغ ہو کر کب سے بجھا ہوا ہے

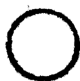
آؤ عدیلؔ آؤ کیوں اتنی دیر کر دی!
کب سے تمہاری خاطر ساغر رکا ہوا ہے



قطعہ

ہیں کچھ لوگ ایسے مقدّر کے مارے
چمن میں ہوں گل جیسے صرصر کے مارے
بہت کچھ ہے کہنا زباں بھی ہے منہ میں
مگر بولتے کچھ نہیں ڈر کے مارے





آتی ہوئی ہر سانس ہے جینے کی نشانی
جاتی ہوئی ہر سانس کہانی ہی کہانی

مغرور ہے کس بات پہ بہتا ہوا پانی
دیکھی نہیں شاید مرے اشکوں کی روانی

پرسش بھی جوانی کے گناہوں کی نہ ہوگی
یہ سچ ہے اگر خواب میں داخل ہے جوانی

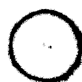
دل تھام کے رہ جائیں نہ کیوں دیکھنے والے
اللہ رے یہ حسن یہ بھرپور جوانی

قطروں کو فنا کر کے نہیں خود بھی سکوں سے
تھمنے نہیں پاتی ہے سمندر کی روانی

چڑھتے ہوئے سورج کا اُجالا ہے محبت
گرتی ہوئی دیوار کا سایہ ہے جوانی

فطرت ہے جداگانہ عندلیبِ آتشِ گل کی
گرتی نہیں بجلی کی طرح شعلہ فشانی





قدرِ علم و ہنر نہیں نہ سہی
آپ بھی دیدہ ور نہیں نہ سہی

ہم لڑیں گے ضرور طوفاں سے
ڈوبنے سے مفر نہیں نہ سہی

سر چھپانے کا آسرا تو ہے
گھر کے معنی ایں گھر نہیں نہ سہی

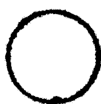
دھوپ میں تم پگھل نہ جاؤ گے
راہ میں اک شجر نہیں نہ سہی

چار دن کی حیات ہی کیا ہے
حسبِ منشا اگر نہیں نہ سہی

ساری دنیا کے غم تو دل میں ہیں
اک خوشی کا گزر نہیں نہ سہی

کیا یہ کم ہے کہ ہوں چمن میں عدیلؔ
حق چمن پر اگر نہیں نہ سہی





زندگانی اس کی جھولی میں نہ ڈالی جائے گی
موت بے وقت آئے گی تو ہاتھ خالی جائے گی

جو سزا ہے عاصیوں کی حرفِ آخر ہی سہی
کچھ نہ کچھ اس میں بھی گنجائش نکالی جائے گی

میری غرقابی کے خواہاں ڈوب کر رہ جائیں گے
میری کشتی ڈوبنے سے گر بچالی جائے گی

آپ اپنی زلفِ پیچاں کو رکھیں اپنے ہی پاس
یہ بلا ہم سے کسی صورت نہ پالی جائے گی!

چھپ سکے گا بحر کے اندر کہاں تک اے صدف
سطح تو ہے سطح ہی، تہہ بھی کھنگالی جائے گی

زندگی تصویر ہے اک وقت کی دیوار پر
وقت بدلے تو جگہ سے یہ ہٹالی جائے گی

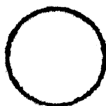
موت کہتی ہے کہ دیدوں گی حیاتِ جاوداں
پُرکشش ہے پیشکش اس کی نہ ٹالی جائے گی

کوئی بات ان کو ہماری یاد ہی رہتی نہیں!
کب نہیں معلوم ان کی بے خیالی جائے گی

زندگی آواگون میں ہو دوبارہ بھی اگر
کیا ضروری ہے اسی صورت میں ڈھالی جائے گی

زندگی میں زندگی کا اجر ملنا چاہیئے
یہ امانت مفت ہی کب تک سنبھالی جائے گی

آتے آتے موت آئے گی کسی دن اے عدیلؔ
جاتے جاتے زیست ہے جو جانے والی جائے گی



ہو کے جب مغلوب غم سے ہر خوشی رہ جائے گی
دل کی غداری پہ سر کو پیٹتی رہ جائے گی

نسلِ آدمؑ جب جہاں میں آخری رہ جائے گی
اس کے دم سے ہے جو رونق سب دھری رہ جائے گی

میں چلا جاؤں اگر میری کمی رہ جائے گی
ہر نظر محفل میں مجھکو ڈھونڈتی رہ جائے گی

تیری رادھا ہو کے جس دن غیر کی رہ جائے گی
اے کنہیا ہاتھ میں بس بانسری رہ جائے گی

واہ جب دشمن سے اچھے کرنے لگ جائیں گے دوست
دوستوں کے منہ کو تکتی دشمنی رہ جائے گی

بند کیوں کرتے ہیں اتنی بجتنگی سے قبر کو
کیا نکل بھاگے گا مردہ گر کھلی رہ جائے گی

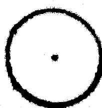
آپ آئے تو قرار آیا مگر جانے کے بعد
بے قراری تھی جو پہلے پھر وہی رہ جائے گی

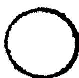
خاک سے آدمؑ بنے تو یہ توقع تھی کسے!
خاک نور و نار سے ہو کر بڑی رہ جائے گی

رسمِ دنیا ہے عیادت کیجئے بیمار کی
دل بھی رہ جائے گا اس کا بات بھی رہ جائے گی

کیا خبر تھی مہر و مہ کو ہے جو ایں وہ کرن!
ماند جس کے آگے ان کی روشنی رہ جائے گی

ان کو پانا ہے تو گزرو ہر گلی سے اے عدیل
آخری میں لازماً ان کی گلی رہ جائے گی





نہ چھوڑتا کبھی تنہا خیالِ یار مجھے
اڑا نہ لیں کہیں صحرا و کوہسار مجھے

نہ دے جنون کی ترغیب اے بہار ابھی
ابھی ہے اپنے گریباں پہ اختیار مجھے

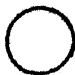
نظر میں ان کی دکھائی دیا نہ پیار مجھے
وہ آگئے بھی تو ان کا ہے انتظار مجھے

ہوائے دشت کے جھونکوں میں اک جھنجھوڑ سی ہے
تلاش کرتی ہے شاید نگاہِ یار مجھے

میں خود کو بانٹ کے دکھ دوں گا غم کے ماروں میں
اگر حیات پہ مل جائے اختیار مجھے

گئے وہ دار سے کیوں اشکبار کیا جانے
جو لوگ ہنستے ہوئے لائے سوئے دار مجھے

عدیل میرا لہو رائیگاں نہ جائے گا
کریں گے یاد گلستاں میں برگ و بار مجھے





اگر سب کے لیئے یکساں نگاہِ یار ہو جائے
کہاں کی زندگانی موت بھی دشوار ہو جائے

اگر قائم تصور میں جمالِ یار ہو جائے
نظر ڈالوں جہاں میں وہ جگہ گلزار ہو جائے

بہت ہے اک جھلک بھی ان کے جلوے کی نظر والو
اُجالا تیز ہو تو آنکھ ہی بے کار ہو جائے

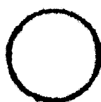
ہے اپنا نفس غافل تو یہ عالم ہے گناہوں کا
نہ جانے کیا غضب ڈھائے اگر ہشیار ہو جائے

تعجب کیا تھپیڑوں میں جو ہم ساحل تک آ پہنچے
یہی مقصد تھا طوفاں کا کہ بیڑا پار ہو جائے

وہ جینا کیا کہ رہ جائے تمنا دل میں جینے کی
جیئے اتنا کوئی جینے سے خود بیزار ہو جائے

عدیلؔ اس وقت وہ پرسش پہ مائل ہو تو کیا ہوگا
غمِ دل بڑھ کے جب ناقابلِ اظہار ہو جائے





جہاں بھی آپ کا پایا ذرا گماں میں نے
پڑاؤ ڈال دیا دوڑ کر وہاں میں نے

رہی نہ تاب جب آوارگی کی سجدوں میں
جبیں کو کر دیا پابندِ آستاں میں نے

ہے اتنا یاد کہ دیکھا ضرور ہے لیکن
نہیں ہے یاد کہ دیکھا تجھے کہاں میں نے

جمالِ شمس و قمر ہو کہ حسن لالہ و گل
تمہارے جلوے نہ دیکھے کہاں کہاں میں نے

گرانا برق کو مقصود تھا بلندی سے
اسی غرض سے بنایا تھا آشیاں میں نے

کسی کے نقشِ قدم کو چھپانے نظروں سے
کئے ہیں کتنے ہی سجدے یہاں وہاں میں نے

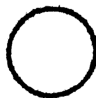
نہ جانتا تھا کوئی آج سب ہی واقف ہیں
کہاں سے آپ کو پہنچا دیا کہاں میں نے

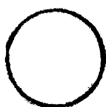
چمن کے پھولوں سے لے کر فلک کے تاروں تک
تجھے تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے

اجل ذرا مری [illegible]ادلی کی داد تو دے
چھپا کے خود [illegible] ہے تجھے عیاں میں نے

چلے تھے ساتھ مگر ساتھ چل نہ سکے
رکی نہ عمر وہاں دم لیا جہاں میں نے

اسے کچھ ایسا لگا جیسے غم اسی کا ہو
کیا ہے جس سے عدیل اپنا غم بیاں میں نے





عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے

تری گلی میں جو اکثر دکھائی دیتا ہے
کچھ اس کے پانو میں چکر دکھائی دیتا ہے

وہ اشک جس کا تسلسل ہے چشمِ آدمؑ سے
وہ قطرہ ہو کے سمندر دکھائی دیتا ہے

وہ آدمی ہے بڑا ہو نظر بڑی جس کی
ہمالیہ اسے کنکر دکھائی دیتا ہے

عجب نہیں کہ ہو کوئی چھپا ہوا رہزن
جو رکھ رکھاؤ سے رہبر دکھائی دیتا ہے

جو کھینچتا ہے لکیریں فقط لکیروں پر
وہ اک فقیر سے بدتر دکھائی دیتا ہے

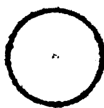
دکھا کے آس مجھے گھر کی تم کہاں لائے
یہاں تو ہر کوئی بے گھر دکھائی دیتا ہے

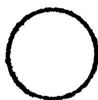
جو غمگسار ہے اس دور میں بھی لوگوں کا
وہ شخص کوئی پیمبر دکھائی دیتا ہے

جو دیکھنا ہو تو دیکھو پہاڑ پر چڑھ کر
ہر اک مکان کا منظر دکھائی دیتا ہے

کبھی ملے تھے وہ برگد تلے مگر اب تک
نظر نظر وہی منظر دکھائی دیتا ہے

بہت بڑا نظر آیا تھا کل جو ہم کو عدیلؔ
وہ آج ہم سے بھی کمتر دکھائی دیتا ہے





کس قدر ہم پہ فضلِ باری ہے
اس کی جو چیز ہے ہماری ہے

جب سے نظروں میں ایک ناری ہے
کھویا کھویا ہوا پجاری ہے

وہ نظر کیا کوئی کٹاری ہے
اس کی جو ضرب بھی ہے کاری ہے

آدمی کی جو خاکساری ہے
تنِ خاکی کی پاسداری ہے

ہاتھ اُٹھا کر میں کس لئے مانگوں
یہ تو خود اُس کی ذمّہ داری ہے

کیوں نہ انسان سے جلے ابلیس
نار کا ہے خمیر ناری ہے

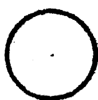
کوئی اپنا سکا نہ دنیا کو
بدنصیب آج تک کنواری ہے

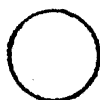
عام رحمت کو کردیا اس نے
کیا گناہوں کی پردہ داری ہے

موت تو خیر موت ہے لیکن
زندگانی کب اختیاری ہے

پھوڑ سکتا ہے سر بھی جو پتھر
خود وہ جذبات و حس سے عاری ہے

شور ہے یہ عدیل لہروں کا
یا سمندر کی آہ و زاری ہے





بات یہ واضح نہیں، باریک سے باریک ہے
زندگانی دین ہے، سوغات ہے یا بھیک ہے

ہو گئی آدم سے لغزش چلئے یہ تو ٹھیک ہے
غور اب کرنا ہے اس پر کس کی یہ تحریک ہے

ذرہ ذرہ اس کے ہونے کا ہے جب زندہ ثبوت
عقل کے مارو کہاں گنجائشِ تشکیک ہے

دور سے بھی دور ہے کوئی حدِ ادراک سے
کیجئے محسوس تو نزدیک سے نزدیک ہے

مانگنے والی پھٹے کپڑوں میں گر نوخیز ہو
بھیک جو ملتی ہے اس کو اور ہی وہ بھیک ہے

سال میں اُٹھتی ہیں دو فصلیں عموماً کھیت سے
اور جس کی حد نہیں کوئی وہ غم کی پیک ہے

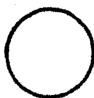
کیسے ہم گزریں گے اُس پل سے نہ جانے حشر میں
تیز ہے تلوار سے جو بال سے باریک ہے

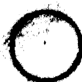
مضحکہ یوں چاہنے والوں کا، کب آڑتا رہے
ٹھنڈے دل سے سوچیئے خود آپ کی تضحیک ہے

کاٹ سکتی ہے برائے حق وہ ہیرے کا جگر
دیکھنے میں پھول کی پتی بہت باریک ہے

غم خوشی سے اہلِ دل کو ہے قبول اس واسطے
غم امانت ہے بڑوں کی ہدیۂ تبریک ہے

جگنوؤں کی زندگی بھی اک تماشا ہے عدیل
رات بھر رہتی ہے روشن صبح کو تاریک ہے





شان ہی کچھ شبِ فرقت کی نئی ہوتی ہے
اک گھڑی اپنی جگہ ایک صدی ہوتی ہے

آپ کیوں غیر کی باتوں کا برا مان گئے
بات چھڑتی ہے تو پھر رائے زنی ہوتی ہے

رنگ ہے بزم کا ایسا کہ گوارا بھی نہیں
اُٹھ کے جاؤں تو تری دل شکنی ہوتی ہے

دلِ مجروح میں ستائیں گے کیسے ارماں
پیڑ چھدرا ہو تو کب چھاؤں گھنی ہوتی ہے

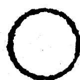
وسعتِ کون و مکاں بھی ہے اسے ناکافی
جس کی آنکھوں میں وسیع النظری ہوتی ہے

غم میں روتا ہوں تو بدنامی ہے تری رسوائی
مسکراتا ہوں تو فطرت کی نفی ہوتی ہے

ہو نہ قائم کوئی معیارِ محبت کا اگر
وہ محبت تو نہیں بوالہوسی ہوتی ہے

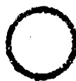
روشنی کیوں مری دنیا میں نہیں اے سورج
اس سے کیا تیرے اُجالوں میں کمی ہوتی ہے

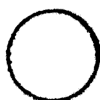
شعر کی فکر نہیں ہے کوئی آسان عدیل
بند شیشے میں بمشکل یہ پری ہوتی ہے



قطعہ

اگر اُلجھنوں میں اُلجھ جائے گا
تو خود انساں حل ان کا سمجھ جائے گا
مثل یہ اسی کے لئے ہے عدیل
اُلجھ جائے گا تو سلجھ جائے گا





من و سلویٰ بھی ہو بے وقت تو بے قدر و قیمت ہے
ملے گر وقت پر تو پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے

نہ کوئی تاج ہے سر پر نہ کوئی جاہ و حشمت ہے
مگر اللہ والوں کی زمانے پر حکومت ہے

لیا تھا کام تو لقمان نے حکمت سے اک حد تک
نہ سمجھے ایک حکمت اور بھی بالائے حکمت ہے

زلیخا نے کیا تھا چاک بے شک دامنِ یوسفؑ
تھا جذبہ اور کچھ اس کا مگر کچھ اور تہمت ہے

رہے یہ بات بھی پیشِ نظر دل توڑنے والے
اگر دل ٹوٹ جائے گا تو ناممکن مرمّت ہے

ہوا کرتے ہیں یوں تو سب مسافر طالبِ منزل
پہنچتا ہے وہ اتنا جلد جس میں جتنی ہمت ہے

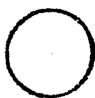
کیا عیسیٰ کو پیدا اور وہ بھی باکرہ ہو کر!
جسے کہتے ہیں عصمت صرف وہ مریم کی عصمت ہے

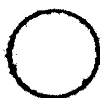
ملے گی حور ملتے وقت لیکن جیتے جی واعظ!
نظر انداز کرنا حسن کو کفرانِ نعمت ہے

نہیں اس کے سوا کچھ معنیٔ اَلعَظمتُ لِلّٰہ
ہے اس کے واسطے عظمت وہی شایانِ عظمت ہے

سراہے جاتے ہیں وہ عاشقوں کو تلخ لہجے میں
ستائش بھی محبت کی بہ اندازِ مذمت ہے

عدیلؔ انسان لے سکتا نہیں جب سانس تک خود سے
گنہ کیسے وہ کر سکتا ہے یہ تو محض تہمت ہے





انساں حصارِ ذات میں مشتِ غبار ہے
نکلے حصار سے تو ستاروں کے پار ہے

یہ بھی تو ایک شعبدۂ چشمِ یار ہے
ہے دیکھنے میں گل تو کھٹکنے میں خار ہے

واعظ کی بندگی بھی ہوس کی شکار ہے
قلب و نظر پہ حور ہمیشہ سوار ہے

یومِ جدید اشارہ ہے رزقِ جدید کا
ہر روز ہر کسی کو نیا روزگار ہے

مجنوں کی بود و باش سے قسمت بدل گئی
شہروں سے بڑھ کے غلغلۂ ریگ زار ہے

اہلِ وفا کا خون نہ عاشق کی خاک سے
ابھری ہوئی بہت رگِ سنگِ مزار ہے

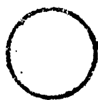
تم دیکھنے کو جاؤ نہ دامانِ کوہ میں
دیکھو ہماری آنکھ میں خود آبشار ہے

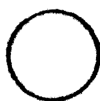
پروانے جل گئے مگر اک آہ تک نہ کی
اک شمع ہے کہ جلتے ہوئے اشکبار ہے

گھبرائے آنسوؤں سے نہ کوئی فراق میں
برسات کی ابھی تو یہ پہلی پھوار ہے

سمجھو نہ کچھ کسی کو تو کچھ بھی نہیں کوئی!
اصلِ وجود کیا ہے فقط اعتبار ہے

میرا سلوک غم سے کچھ ایسا ہے اے عدیل
دنیا کو ہے گماں کہ مرا رشتہ دار ہے





جب میں نے کچھ اندازۂ حالات کیا ہے
اس میں تری مرضی کا اشارہ بھی ملا ہے

اس شہر میں کیا اسلحہ تقسیم ہوا ہے
ہر کوئی نیا زخم لگانے پہ تلا ہے

جب بھی اُسے دیکھا ہے مجھے ایسا لگا ہے
پہلے ہی سے وہ میری طرف دیکھ رہا ہے

جو وار ہوا مجھ پہ وہ بیکار گیا ہے
کچھ ایسی مرے ساتھ مری ماں کی دعا ہے

جب دردِ محبت نے کیا رخ مرے دل کا
دل نے اُسے آنکھوں کی طرف موڑ دیا ہے

سمجھوتہ میں حالات سے کر سکتا ہوں لیکن
مر جائے گا وہ آدمی جو مجھ میں چھپا ہے

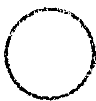
شہکارِ بشر کیوں نہ ہو نقّاشِ ازل کا
سو نقش مٹائے ہیں تو اک نقش بنا ہے

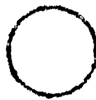
جس شخص کو گھر میں دی جگہ شب بسری کی
اس شخص نے جاتے ہوئے گھر لوٹ لیا ہے

لے جائیں تری لاش کہاں ڈوبنے والے
کپڑوں میں ترے گھر کا پتہ تک نہ ملا ہے

لوگ اُٹھے پہاڑوں کی بلندی سے بھی گر کر
اُٹھّا نہ کبھی کوئی جو نظروں سے گرا ہے

انسان کا تجربہ ہے عدیلؔ آج کا انسان
حالات نے اس طرح اسے چاٹ لیا ہے





غم کو انسان نے نظروں سے گرا رکھا ہے
غم نے انسان کو انسان بنا رکھا ہے

آج بھی مہر و محبت کو روا رکھا ہے
میں نے ان بجھتے چراغوں کو جلا رکھا ہے

دوست نے چہرے کو چہروں میں چھپا رکھا ہے
دشمن اچھا ہے کہ چہرہ کو کھلا رکھا ہے

اے فلک ہم تری اونچائی سے واقف ہیں مگر
تیرا دل رکھنے تجھے سر پہ اٹھا رکھا ہے

بات کیا ہے کہ ملاتا نہیں نظریں ساقی
کیا مرے جام میں کچھ زہر ملا رکھا ہے

کی ہے آدمؑ نے خطا حسبِ مشیّت لیکن
یار لوگوں نے اک افسانہ بنا رکھا ہے

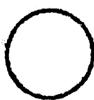
جان دوں گا نہ اجل تجھ کو میں آسانی سے
اک اسی چیز کو مشکل سے بچا رکھا ہے

بیچ میں آؤ نہ تم بات بگڑ جائے گی !
آخری داؤ مقدّر سے لگا رکھا ہے

میں نہیں ہوں نہ سہی آپ ہی حق پر ہوں گے
جانے بھی دیجئے اس بحث میں کیا رکھا ہے

میں کہیں بھاگنے والا تو نہیں ہوں پھر کیوں
موت کو میرے تعاقب میں لگا رکھا ہے

لوگ سمجھے ہیں مجھے اور نہ سمجھیں گے عدیلؔ
خود کو اس واسطے لوگوں سے جدا رکھا ہے





وقت کی بات ہے جب وقت بدل جاتا ہے
وار کمزور سے کمزور کا بھی چل جاتا ہے

نالۂ دل جو تہہ دل سے نکل جاتا ہے
فرش کا ذکر ہی کیا عرش دہل جاتا ہے

کیا سہارے ہی ضروری ہیں سنبھلنے کیلئے
ٹھوکریں کھا کے بھی انسان سنبھل جاتا ہے

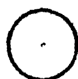
رخ ہوا کا نہیں رکھتا ہے کوئی اہمیت
رخ ہوا کا جو بدل دو تو بدل جاتا ہے

دن بدلتے ہیں تو آنکھیں بھی بدل جاتی ہیں
دھوپ کے ساتھ ہی ہر سایہ بھی ڈھل جاتا ہے

غور کر لو ذرا چہروں کو بدلنے والو!
رفتہ رفتہ لب و لہجہ بھی بدل جاتا ہے

جب بھی ہوتی ہے ہزیمت مرے دشمن کو عدیل
رنگ احباب کے چہروں کا بدل جاتا ہے





نہ لائی وہ بھی اُجالا ہمارے گھر کے لئے
کیا تھا قتل اندھیروں کا جس سحر کے لئے

خدا کے گھر میں اندھیرا رہے تو فکر نہیں
چراغ کرتے ہیں روشن سب اپنے گھر کے لئے

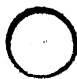
ذرا معاملہ پہلی نظر کا ہے واعظ
سزا کا حکم تو ہے دوسری نظر کے لئے

دکھاؤ جتنی چمک بھی دکھا سکو تارو!
ملا ہے وقت تمہیں صرف رات بھر کے لئے

فرازِ طور سہی یا نشیبِ طور سہی!
نظارہ ہر کہیں ممکن ہے دیدہ ور کے لئے

نظر جمے تو جمے کیسے ایک منظر پر
نئے نئے ہیں مناظر نظر کے لئے

ہوئے شہید ہم احباب کے کرم سے عدیل
نہیں کفن کی ضرورت ہمارے سر کے لئے





اربابِ وفا کی ہر مشکل معیاری سے معیاری ہے
مرنے کا قرینہ یاد نہیں جینے میں بڑی دشواری ہے

راتوں میں کسی کی آہوں سے کچھ خوف یقیناً طاری ہے
یہ اوس نہیں ہے گردوں کے ماتھے سے پسینہ جاری ہے

گردوں جو دکھائی دیتا ہے وہ اصل میں حد ہے نظروں کی
تارے جو دکھائی دیتے ہیں وہ نظروں کی گلکاری ہے

صدمے جو قضا سے بڑھ کر تھے ہم ان سے تو زندہ بچ نکلے
دیکھیں گے قضا کیا کرتی ہے اب ایک اسی کی باری ہے

وہ آنکھ میں آنسو لا لا کر آنسو مرے پونچھے جاتے ہیں
حیراں ہوں میں آنکھیں مل مل کر یہ خواب ہے یا بیداری ہے

ہیں کب سے سفر میں شمس و قمر طے ان کا سفر ہوتا ہی نہیں
یا ان کی کوئی منزل ہی نہیں یا راہ میں ناہمواری ہے

بڑھتی ہے کہاں سے ان میں تپش کہسار جو پھٹتے رہتے ہیں
کب آگ لگی تھی زیرِ زمیں یہ کب کی دبی چنگاری ہے

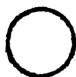
دیدار سے پہلے ضبط نہ تھا دیدار ہوا تو ہوش نہیں
جب ایک مصیبت طاری تھی اب ایک مصیبت طاری ہے

دنیا میں اگر پھر آنا ہو دل لے کے نہیں آئیں گے عدیل
اک بات ہوئی تو سہہ لیں گے ہر بات میں دل آزاری ہے



قطعہ

آنا ہے اگر اوج پہ پستی سے نکل کر
عجلت سے نہیں صبر سے آغازِ عمل کر
عجلت کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا
گرتا ہے بری طرح سے فوارہ اچھل کر



دیارِ گنگ و جمن

(قومی یکجہتی کے نام)

نیلے آکاش کے رخساروں پر
ہونٹ رکھے ہیں ہمالہ نے جہاں
برف کے پردے ڈالے
ایشیا کے اس فردوس نما خطے پر
چھاؤنی حدِ نظر تک ہے بنی آدم کی
نام ہے بھارت جس کا
اس میں بستے ہیں کئی صدیوں سے
کتنے ہی مذہب و ملت کے لوگ
کسی گلشن میں کئی رنگ کے پھولوں کی طرح
آج سے پہلے مگر
آج کی طرح نہ تھا فرقِ حیات
نام تھے سب کے الگ اور عقائد بھی الگ
تھے مگر سب ہی وطن کی رونق
فرقہ بندی کا، تعصب کا کہیں نام نہ تھا
ہر طرف امن کے پرچم تھے بلند
ہر طرف پیار نظر آتا تھا
جیسے ہر ذرے میں ہو پیار کا سورج روشن
جگمگاتے ہوئے پھرتے تھے وفا کے جگنو

اور پیغامِ اخوت تھا رواں
شکل میں گنگ و جمن کی ڈھل کر
اہلِ مسجد سے گلے ملتے تھے
پیار کے نام پہ مندر والے
نقش ہے آج بھی چتوڑ کی دیواروں پر
کس طرح ایک شہنشاہ چلا آیا تھا
اپنی آنکھوں میں تصور کو لئے
ہاتھ پہ باندھی ہوئی راکھی کا
اہلِ چتوڑ کو دشمن سے بچانے کے لئے
لاج رکھنے کو رواداری کی
کوئی سمجھے نہ اسے دورِ الف لیلیٰ کا
تھا حقیقت میں کچھ ایسا ہی حسیں
ہند کا دورِ ماضی
جس کے دن رات پہ قربان تھے
خود شمس و قمر
جس کی یادیں ہیں ابھی تک باقی
قلبِ تاریخ کی دھڑکن بن کر
آج بھی جب ہیں وہی شمس و قمر
کس لئے اگلے سے دن رات نہیں
وہ مہکتے ہوئے جذبات نہیں
آج سے پہلے یہی آنکھیں تھیں
پیار کے نورِ اخوت کی ضیا سے روشن
آگئے ان میں کہاں سے آخر
اجنبیت کے بھیانک سائے

یوں جبیں پر ہے شکن
ہو جبیں جیسے شکن ہی کے لئے
بانٹنے والے غم آپس میں کبھی
یوں اُلجھ جائیں اگر آپس میں
جیسے فرزند نہیں بھارت کے
کیوں نہ دنیا کو تعجب ہوگا
دیکھتی آئی ہے دنیا اب تک
گلستانوں میں کئی رنگ کے پھول
پھول ہنسنے کے لئے ہوتے ہیں
پھول ہوتے ہیں مہکنے کے لئے
پھول ہوتے نہیں پھولوں کے حریف
پھول آپس میں نہ اُلجھے ہیں نہ اُلجھیں گے کبھی
سمجھ لیں یہ رازِ چمن
جان لیں بھارت والے
اور پھر پونچھ دیں تاریخ کے بہتے آنسو
اپنے ہاتھوں میں لئے
یکجہتی کا دامن



اصلاحِ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی

۱۶ ستمبر ۱۹۵۲ء

غزل

۱ شد اللہ حسن بھرپور ہے پیرِ شباب ۔ یکجا ہیں مہر تاب و ماہ تاب (ایک جگہ)

۲ کیوں نہ باور ہو کہ ہے [illegible] بے نقاب ۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

۳ دونوں کا دل آرزو دونوں لاجواب ۔ کمسنی کلیوں کی میووں کا شباب

۴ کیوں گناہوں سے کریں ہم اجتناب ۔ زندگی کا دل خراب آخر خراب

۵ تو کسی آنا کسی کا ہو گیا ۔ عاقبت دشمن دل خانہ خراب
— جان دیتا ہے یہ اہلِ حسن پر

۶ دیکھنے کو شام تیرہ بخت ہے ۔ توڑ دیتی ہے غرورِ آفتاب (۳)

۷ زندگی کے بعد ہے [illegible] زندگی ۔ مشتمل ہے خواب پر تعبیرِ خواب
— موقوف ہے / مشتمل ہے

۸ گھر ہیں کچھ دیر کا مہمان ہوں ۔ دیکھ لیجئے کا غروبِ آفتاب (۱)

۹ اے گناہ اولیں باشدہ یاد ۔ ہو رہی ہے آج تک مٹی خراب

۱۰ پرسشِ عصیاں کی زحمت کس لئے ۔ تم تو واقف ہو کہ ہم ہیں لاجواب
— زحمتِ پرسش بھی آخر کس لئے

۱۱ ہم کو اپنی زندگی سے لے چلے ۔ مرتے دم [illegible] کھلی رکھ دی کتاب

۱۲ ہو وہی مٹی کا پیکر [illegible] ۔ اپنے خالق کا ہے حسنِ انتخاب
— خاک کے انسان بنا تو کیا ہوا

حاشیہ: فارسی ترکیب — یکجا، یکساں — یک دل — ایک جا — ایک ساں — ایک دل غلط

گر نہ جائے

۴ وہ کہ ساقی رہی چشم مست کو ~~گر رہا ہے؟~~ مجھ سے جام شراب

کر دیا
نے

۴ دل پہ داغوں کا سایہ ہی چھا گیا ~~ہو گیا وہ دن کے~~ مدھم آفتاب (۲)

پائی ہے انسان نے

۴۴۳ بے ثباتی ~~آدمی ہو گیا تھی~~ سطح پر مٹی کی ابھرا ہوا حباب

جلوہ فرما ہے کوئی دل میں عدیلؔ

بہت خوب! کون ہے در مشعر اعلم یا بقول محاورہ آپ کا ہو گیا

۳ - مقامات سلسلہ دار کیجئے

۲ - فکر میں یہ گہرائی و گیرائی مبارک!

صفی اورنگ آبادی
۲۴ - نومبر ۱۹۵۲ء

نوٹ :- میرا یہ مسودۂ غزل جس میں حضرت صفیؔ کی اصلاح، گراں قدر رائے، اور ان کے دستخط ثبت ہیں ؛ اگر بر وقت دستیاب ہوتا تو محبوب علی خاں اخگرؔ کی تالیف کردہ کتاب "اِصلاحاتِ صفیؔ" میں شریک کیا جا سکتا تھا۔ تاہم اس کو محفوظ کرنے کی خاطر میں نے اس کو اپنے مجموعۂ کلام میں تبرکاً و نمونتہً شریک کر دیا ہے۔

(عدیلؔ)